اصلاحی اور تعلیمی تحریکوں کا مختصر خاکہ بیان کرکے اس عہد کے ادب کا جائزہ لیا گیا ہے، دوسرے باب میں حسرت کے حسب و نسب، تعلیم اور واقعات زندگی اور تیسرے میں ان کی سیرت شخصیت اور اخلاق و اوصاف کا مفصل ذکر ہے، آخر کے پانچ ابواب میں حسرت کی علمی خدمات شاعری صحافت نگاری، تذکرہ نویسی، تنقید نگاری، اور ان کی دوسری تصنیفات پر بحث کی گئی ہے، لیکن جس طرح شاعری، تنقید اور تذکرہ نگاری میں حسرت کے مرتبہ کو واضح کرنے کے لئے ان کے پیشروؤں کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں، اسی طرح ان سے پہلے کی صحافت نگاری کا بھی مختصر جائزہ لینا چاہئے تھا، ص ۴۴ کے حاشیہ میں مولانا محمد علی کے نام کے ساتھ کانپوری لکھا گیا ہے، وہ کانپور کے ضرور تھے، لیکن مونگیر جاکر آباد ہوگئے، اس لئے ان کے نام کا جزء مونگیری ہوگیا، مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ ان کی وفات کے بعد مولانا شبلی ندوہ کے ناظم مقرر ہوئے، حالانکہ مولانا شبلی کبھی ندوہ کے ناظم نہیں بلکہ معتمد تعلیم رہے، اور ان کی وفات ۱۹۱۴ء میں ہوئی، جبکہ مولانا مونگیری کا انتقال ۱۹۲۷ء میں ہوا، اسی طرح کے اور واقعات بھی محل نظر ہیں، تاہم اس کی ترتیب اور انداز بیان میں خوش سلیقگی سے کام لیا گیا ہے، مولانا حسرت موہانی ادب و سیاست دونوں میں ممتاز اور بعض اوصاف و کمالات میں بے نظیر تھے، اس لئے فاضل مصنف نے ان کو اپنے تحقیقی مقالہ کا موضوع بناکر ایک ادبی حق ادا کر دیا ہے، آخر میں مراجع و مصادر کی مکمل فہرست کے علاوہ دو ضمیمے بھی ہیں، پہلے میں ان شعرا کی فہرست دی گئی ہے جن کے تذکرے حسرت نے خود لکھے یا دوسروں سے لکھوائے تھے، اور دوسرے میں ان کی ان نظموں کو شامل کیا گیا ہے، جو کلیات میں درج نہیں ہیں۔

"ض"

جلد ۱۱۵ ماہ جون ۱۹۷۵ء مطابق ماہ جمادی الثانی ۱۳۹۵ھ عدد ۶

مضامین

مقالات

تصحیح

معارف مئی ۱۹۷۵ء کے ص ۳۶۹ پر مضمون نگار کا نام مسودہ میں ناصاف لکھا ہونے کے باعث جلال الدین غلط چھپ گیا ہے اصل نام عبد الرشید ہے،

"اڈیٹر"

شذرات

اردو کی موجودہ نثر نگاری کی عمر کچھ زیادہ لمبی نہیں، مشکل سے سوا سو برس کی ہوگی، یہ علماء کی مجلس کی بھی زینت بنی رہی، اور انگریزی دانوں کی بزم کی بھی رونق بڑھاتی رہی، دونوں کی علیحدہ علیحدہ کاوشوں سے اسکے علوم و فنون کی کمیت اور اسلوب کی کیفیت میں جو ترقی ہوئی وہ ایک دلچسپ موضوع ہے،

علماء نے مذہبی علوم کو اس زبان میں منتقل کرنے میں جس عجلت اور جانفشانی سے کام لیا ہے وہ ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے، کلام پاک کے اردو ترجمے تو اتنے ہو چکے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے طویل دور حکومت میں اس کے فارسی ترجموں کی جو کمی تھی، اس کی پوری تلافی ہوگئی ہے، اسکی تفسیریں بھی بڑی محنت بلکہ جانکاہی سے لکھی گئیں، مولانا امیر علی نے تو تنہا مواہب الرحمن کے نام سے تیس ضخیم جلدیں لکھ کر ایک عظیم کام انجام دے دیا ہے، سرسید احمد خاں نے بھی چھ جلدوں میں ایک تفسیر لکھی، مولانا اشرف علیؒ کی بیان القرآن اور مولانا ابوالکلام آزاد کی ترجمان القرآن پر تو بجا طور سے فخر کیا جا سکتا ہے، امام رازی کی اہم تفسیر بھی اردو میں منتقل کی جا چکی ہے، احادیث میں بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ وغیرہ کے بھی ترجمے ہو چکے ہیں، فقہ میں ہدایہ، شرح وقایہ، قدوری، کنز، درمختار اور فتاویٰ عالمگیری کی پوری جلدوں کے ترجمے کرکے علماء نے اس زبان کی بڑی خدمت انجام دی ہے، سیرۃ النبی پر جتنا اچھا کام علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی نے کیا، کسی اور زبان میں شاید ہی ہوا ہو، تصوف میں کشف المحجوب، تذکرۃ الاولیاء، عوارف المعارف، مکتوبات حضرت شرف الدین یحییٰ منیری، مکتوبات امام ربانی اور شاہ ولی اللہ کی تصانیف بھی اردو کا جامہ پہن چکی ہیں، امام غزالی، ابن خلدون اور ابن تیمیہ کے علاوہ اور دوسرے مشاہیر اسلام کے کارناموں سے اردو زبان روشناس ہو چکی ہے، اس قسم کے قیمتی علمی سرمایہ سے اس زبان کے وقار میں بڑا اضافہ ہوا،

اردو میں تاریخ نویسی کے فن کو فروغ دینے میں بھی علماء کا نمایاں حصہ ہے، ان ہی کی محنت سے ابن خلدون کے علاوہ طبری، اور ابن اثیر کی تاریخوں کے ترجمے ہوئے، مولوی ذکاء اللہ نے تاریخ ہند کی ۱۵ جلدیں، مولانا محمد حسین آزاد نے

دربار اکبری، علامہ شبلیؒ نے المامون اور مضامین عالمگیر، اور مولانا سید سلیمان ندوی نے عرب و ہند کے تعلقات لکھ کر اس فن میں تحقیق و تلاش کرنا سکھایا، سوانح نگاری میں مولانا حالی کی حیات سعدی، یادگار غالب اور حیات جاوید، علامہ شبلی کی الغزالی، سیرۃ النعمان، سوانح مولانا روم، مولانا سید سلیمان ندوی کی حیات شبلی، اور خیام، مولانا اکرام اللہ خاں ندوی کی وقار حیات، اور شاہ معین الدین احمد ندوی کی حیات سلیمان سے بہتر سوانح عمریاں اب تک نہیں لکھی جا سکی ہیں، صحابہ کرام، تابعین، محدثین، ائمہ اسلام اور صوفیائے کرام کے مستند سوانح علماء ہی کی سرگرمیوں سے مرتب ہوئے ہیں، تنقید نگاری میں بھی انہی کو اولیت حاصل ہے، آب حیات، مقدمہ شعر و شاعری، شعر العجم، موازنہ انیس و دبیر، گل رعنا، شعر الہند اور تاریخ داستان اردو ایسی زندۂ جاوید کتابیں ہیں جن سے ہر زمانہ میں استفادہ کیا جائیگا، لغت نویسی میں بھی انہی کو فضیلت ہے، نور اللغات، امیر اللغات، جامع اللغات اور فرہنگ آصفیہ کی تدوین و ترتیب انہی کی رہین منت ہے، علماء کی ثقاہت اور ناول نگاری بظاہر متضاد چیزیں ہونے کے باوجود مولانا نذیر احمد، مولانا عبد الحلیم شرر، حکیم محمد علی ہردوئی اور مولانا راشد الخیری کے ناول برابر یاد رکھے جائیں گے، علماء کے ان تمام کارناموں سے اردو ایک جاندار اور شاندار زبان بنی،

اردو کی موجودہ نثر نگاری کے ابو الآباء سرسید ہیں، مگر ان کے علمی ورثہ پر دونوں گروہوں کا حق برابر ہے، اگرچہ وہ جدید تعلیم یافتہ گروہ کے سالار کارواں تھے، تو روشن خیال علماء کے بھی سرخیل رہے، البتہ علی گڈھ اسکول اور اسکے ہم نواؤں سے امید تھی کہ وہ غیر مذہبی علوم پر کتابیں لکھ کر اس زبان کو متمول بنائیں گے، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے مقصد معاشیات، خواجہ غلام السیدین نے اصول تعلیم، پروفیسر محمد مجیب نے تاریخ فلسفہ سیاسیات لکھ کر مفید علمی خدمت ضرور انجام دی، مگر اب تک یہ زبان سائنس، معاشیات، سیاسیات، عمرانیات، تعلیمات، نفسیات، اور گہرے فلسفیانہ مباحث وغیرہ سے بہت زیادہ آشنا نہیں، اسکی تلافی غیر زبانوں سے ترجمے کرکے ہو سکتی تھی، سید علی بلگرامی، عنایت اللہ، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین نے ترجمے کے فن کی بڑی آبیاری کی، لیکن اس آغاز کو انجام تک پہنچانے کی ضرورت باقی رہی، عثمانیہ یونیورسٹی کے دار الترجمہ میں اس گروہ کا بہت کچھ حصہ رہا، مگر اسکی بعض مطبوعات میں ترجمہ کے فن کو معاوضہ پانے کی عجلت میں جس طرح قربان کیا گیا وہ ایک علمی المیہ ہے، جو امید ہے کہ حکومت ہند کے موجودہ اردو بورڈ کے ترجموں کی طرف سے نہ دہرایا جائیگا،

اس وقت ناول نویسی اور افسانہ نگاری پر انگریزی دانوں ہی کا تسلط ہے، ناول نویسی کا فن آگے بڑھکر رُک گیا تو رُکا ہوا ہے، مستقبل قریب میں کسی رتن ناتھ سرشار اور پریم چند کے پیدا ہونے کی امید نہیں، البتہ اردو افسانہ نگاری میں بڑی ترقی ہوئی، اس کے افسانوں کے بعض مجموعے دنیا کے بہترین مجموعوں کے ساتھ رکھے جا سکتے ہیں، گو ابھی تک اُن سے ہندوستانی تہذیب و ماحول کا کوئی شاہکار کردار نہیں مل سکا ہے، صحافت نگاری پر زیادہ تر انگریزی تعلیم یافتہ گروہ ہی چھایا ہوا ہے، مگر اردو کی صحافت نگاری یہاں کی انگریزی جیسی غیر ملکی زبان کی صحافت نگاری کی طرح ایک موثر قوت نہیں بن سکی ہے، ماہانہ رسالے اور ڈائجسٹ نکالنے میں یہی گروہ آگے آگے ہے، جس سے زبان کی ترویج اور اشاعت تو ضرور ہو رہی ہے، مگر ان میں تحقیقی اور علمی مضامین کی کمی پائی جاتی ہے، جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے بعض ارباب ذوق نے مزاح نویسی اور طنز نگاری کی سطح اونچی کر دی ہے، مگر اب ایک سطح پر آکر رُک گئی ہے، اسی طبقہ کے بعض حلقوں میں ترقی پسند ادب کی تحریک کی آندھی کارل مارکس اور سگمنڈ فرائڈ کے سہارے اٹھی، مگر اب اس کا وہ زور باقی نہیں رہا، جدیدیت کے نام سے اب ایک نئی تحریک چل نکلی ہے،

یونیورسٹیوں کے بعض ذہین اساتذہ نے اپنی تنقید نگاری سے ادبی شعور میں بڑی رنگا رنگی پیدا کر دی ہے، جس سے شعر و ادب کے گیسو کو سنوارنے میں بڑی مدد مل رہی ہے، یورپ اور امریکہ کی تنقیدی نظر و فکر انہی کے ذریعے روشناس ہو رہی ہے، مگر اُن کا یہ تنقیدی لٹریچر زیادہ تر مقالات کی صورت میں شائع ہو رہا ہے، جن کے انبار کے نیچے ٹھوس تصانیف دب کر رہ گئی ہیں، مقالہ نگاری سے ایجاز و اختصار کے فن کو تو ضرور فروغ ہوا، مگر ان کے مجموعوں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے سہل انگاری اور ہلکی پھلکی ذہنی اور ادبی تفریح بازی کا بھی اظہار ہوتا ہے، اردو زبان کی حقیقی ترقی اسی وقت ہوگی، جب پوری عرق ریزی اور تن دہی سے سنجیدہ علوم کا ڈھیر لگا دیا جائیگا، دیکھنا ہے کہ اس ڈھیر لگانے میں کون سبقت لے جاتا ہے،

اردو ادب کے اسلوب بیان پر انگریزی داں طبقہ کا بڑا اثر پڑا ہے، ان کے بعض ادیبوں کے طرز تحریر سے اردو نثر نگاری کا مسِ خام کندن بنتا جا رہا ہے، مگر ان میں ابھی تک حالی، آزاد، نذیر احمد، شبلی اور ابو الکلام آزاد کے ٹکر کا کوئی صاحب طرز ادیب پیدا نہیں ہو سکا ہے،

مقالات

ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

از سید صباح الدین عبد الرحمن

(۵)

سلطان فیروز شاہ تغلق اگر ہندوؤں کے مذہبی عقائد میں کوئی اصلاح کرنے کی کوشش کرتا تو اس کو یہ حق خود اسلامی قوانین کے لحاظ سے نہ تھا، اس کی خواہش ضرور رہی کہ غیر مسلم زیادہ سے زیادہ دائرۂ اسلام میں داخل ہوں، اس کے لئے اس نے تحریص و ترغیب بھی دلائی، لیکن جبر اختیار نہیں کیا، وہ خود لکھتا ہے کہ میں نے اہل ذمہ کو دین کی رغبت دلائی اور اعلان کیا کہ ان میں سے جو کوئی توحید کا کلمہ پڑھے گا اور دین اسلام قبول کریگا، اس کا جزیہ معاف ہو جائے گا، اور اس کو بہت سے انعامات دیئے جائیں گے، اس اعلان کے بعد بکثرت ہندو مسلمان ہوئے، (فتوحات فیروز شاہی ص ۲۰، علی گڑھ ایڈیشن)

فیروز شاہ تغلق پر مندر شکنی کا الزام

اس پر یہ الزام ہے کہ اس نے ہندوؤں کے بعض مندروں کو منہدم کیا، وہ اپنی فتوحات فیروز شاہی میں خود اعتراف کرتا ہے کہ اس نے تغلق پور، صالح پور اور قصبہ گوہانہ کے نئے مندر منہدم کرا دیئے، (ص ۱۲-۱۱) اس

کے اسباب ایشوری ٹوپا کی زبانی سنئے:

ہندوؤں کے حقوق محفوظ تھے، لیکن اسلامی روایت کے مطابق کسی اسلامی حکومت کے اندر مسلمانوں کی آبادی میں ہندوؤں کو مندر بنانے کا حق نہ تھا، تغلق پور، صلاح پور، اور گوہانہ کو خود فیروز شاہ نے آباد کیا تھا، اس لئے جب وہاں ہندوؤں نے مندر بنائے تو ان کو ضرور منہدم کرا دیا، پھر اس کا سبب یہ بھی تھا کہ یہ مندر بداخلاقی کے اڈے بن گئے تھے، ان کے میلوں میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوتے تھے، عورتیں بھی آتی تھیں، اس لئے یہ مندر عبادت گاہ کے بجائے شیطنت کے مرکز بن گئے تھے،

اس لئے فیروز شاہ نے اسلامی اور اخلاقی جذبہ کے ماتحت ان مخرب اخلاق اڈوں کو منہدم کرا دیا، (پالیٹکس ان پری مغل ٹائمس، ص ۲۴۶-۴۷) یہ الگ سوال ہے کہ فیروز شاہ کو عوام کی بداخلاقی دور کرنے کا حق تھا یا نہیں، حقیقت یہ ہے کہ فیروز شاہ نے جو کچھ کیا تھا، اس میں مذہبی جنون کو دخل نہ تھا، بلکہ محض عوام کے اخلاق کو سنوارنے کیلئے ایسا کیا تھا، اگر اس میں مندروں کے انہدام کا جذبہ ہوتا، تو ہندوستان کے سارے مندروں کو مسمار کر دیتا، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا، بلکہ ذمیوں کے حقوق کی بنا پر باقی اور تمام مندر محفوظ رہے، (ایضاً ص ۲۴)

ایشوری ٹوپا کے اس بیان کی تصدیق فتوحات فیروز شاہی سے بھی ہوتی ہے خود فیروز شاہ کا بیان ہے کہ ان مندروں کو منہدم کراتے وقت اس کی ہدایت تھی کہ عام ہندوؤں کو کسی قسم کی سزا نہ دی جائے،

"سائر ہنود را بہ تعزیرات مولم منع کردیم" (ص ۱۲)

اگر غیر جانبدارانہ طور پر گہرا مطالعہ کیا جائے، تو ظاہر ہوگا کہ جب کسی زمانہ میں

کہیں مندر منہدم کرائے گئے تو اس کا سبب مذہبی تعصب یا جنون نہیں رہا، بلکہ یا تو ان کی دولت پر قبضہ کرنے یا ان کی سیاسی مرکزیت کو برباد کرنے یا ان کی بداخلاقی کو دور کرنے کے لئے کیا گیا، جنگ کے موقع پر ہندو مسلمان ایک دوسرے کی عبادت گاہوں کو نقصان پہنچانے میں دریغ نہ کرتے، ایسی مثالیں بہت ملیں گی کہ ہندوؤں نے مسجدوں کو شہید کر کے ان کی جگہوں پر مندر بنوائے، لیکن ان میں بھی یہ مذہبی جنون نہ تھا، بلکہ اس کے بجائے سیاسی اور جنگی اسباب ہوتے، اور فوجی غارتگری کی زد میں عبادت گاہیں بھی آتی رہیں،

ہندوؤں کے علوم سے دلچسپی

فیروز شاہ نے اگرچہ کچھ مندر منہدم کرائے تو اسی کے حالات زندگی میں یہ بھی ہے کہ جب ۱۳۶۱ء میں وہ نگرکوٹ پہنچا تو یہاں ہندوؤں کے علوم سے متعلق جو کتابیں تھیں ان کی بابت معلومات حاصل کر کے خوش ہوا، پنڈتوں کو بلا کر ان کا ترجمہ کرنے کی فرمائش کی، ان میں سے ایک کتاب میں فلسفہ، نجوم اور الٰہیات سے متعلق مفید معلومات تھیں، فیروز شاہ نے اس کا فارسی میں ترجمہ کرانے کا حکم دیا، اس زمانہ کے مشہور شاعر عزالدین خالد خانی نے اس کا ترجمہ کیا، اور نام دلائل فیروز شاہی رکھا، (تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۱۴۶ نولکشور پریس و منتخب التواریخ جلد اول ص ۲۴۹) ان ہی کتابوں میں علم ہیئت پر ساراولی اور علم نجوم و ہیئت پر رسالہ ۔ عربی کے بھی فارسی میں ترجمے کئے گئے، فیروز شاہ ہی کی فرمائش سے علم نجوم پر سنسکرت کی ایک اہم کتاب برہم سیتا مہا لکھ ورہ مہر کا فارسی ترجمہ تاریخ فیروز شاہی کے مصنف شمس سراج نے کیا، (فہرست مخطوطات فارسی انڈیا آفس لائبریری جلد اول کالم ۱۱۱۱، ۱۱۱۲) پروفیسر کے ایم اشرف کا بیان ہے کہ فیروز شاہ پر مذہبی تعصب کا

الزام رکھا جاتا ہے، لیکن وہ ایک ہندو شاعر، تن سیکھر کا بڑا احترام کرتا رہا (مرر آف انڈیا ص ۱۳۱) اس کا یہ احترام ہندو راجاؤں کے ساتھ بھی قائم تھا، ہر موقع پر انکی تعظیم و تکریم کرتا رہا، مولانا ضیاء الدین برنی ہندوؤں کو رسوا کرنے پر خوش ہوتے لیکن ان کا خود بیان ہے کہ جب فیروز شاہ اپنے شاہی دورہ پر گورکھپور اور کھروسہ پہنچا، تو وہاں کے رایان اپنے مقدموں اور راناؤں کے ساتھ اس کے دربار میں آئے، فیروز شاہ نے ان کو شاہانہ نوازشوں سے نوازا، برنی کے الفاظ یہ ہیں

"رای گورکھپور باخدمتیات خود زنجیر پیل گذرانیدند و از عواطف خسروانہ چتر و تات و قبائے مکلل و مرصع و اسپان تنگ بستہ یافت چند مقدمان دیگر کہ در ولایت او بزرگ و دارا بودند با او جامہ پوشیدند و رای کھروسہ نیز باندازہ ولایت خود خدمتیات گذرانید و با مقدمان ولایت خود جامہ یافت و کسوت مرحمت پوشید و رایان مذکور از سر اخلاص حلقہ بگوش کشیدند و منقاد و مطیع درگاہ اعلیٰ شدند" (ص ۵۸۷-۵۸۸)

جزیہ

فیروز شاہ نے ہندوؤں پر جزیہ عائد کیا، اس کو غیر اسلامی قانون تو نہیں کہا جا سکتا ہے، لیکن ہندوؤں کی نظر میں یہ رجعت پسندی سمجھی جاتی ہے، اور قابلِ مذمت بھی، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے پورے دور حکومت میں جزیہ کی نوعیت اور اصلیت کو اچھی طرح واضح نہیں کیا گیا، مولانا شبلی نے بیسویں صدی میں جزیہ کی حقیقت کو جس طرح سمجھایا ہے، اگر اس دور کے علماء بھی سمجھاتے رہتے، تو یہ ٹیکس اشتعال انگیز نہ سمجھا جاتا،

مولانا شبلی نے قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج اور فتوح البلدان کے حوالے سے

جزیہ کی تشریح اس طرح کی ہے کہ بانیِ اسلام یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن قوموں پر جزیہ لگایا، ان کو تحریر کے ذریعہ سے حسب ذیل حقوق دیے (۱) کوئی دشمن ان پر حملہ کریگا، تو ان کی طرف سے مدافعت کی جائیگی، (۲) ان کو ان کے مذہب سے برگشتہ نہیں کیا جائیگا (۳) جزیہ ان سے جا کر لیا جائیگا، ان کے لئے محصل کے پاس خود جانا نہیں پڑے گا (۴) ان کی جان محفوظ رہے گی (۵) ان کا مال محفوظ رہے گا، (۶) ان کے قافلے اور کارواں (تجارت) محفوظ رہیں گے (۷) ان کی زمین محفوظ رہے گی، (۸) تمام چیزیں جو ان کے قبضہ میں ہیں بحال رہیں گی (۹) پادری اور جاثلیق گرجوں کے پجاری اپنے عہدوں سے برطرف نہیں کئے جائیں گے، (۱۰) صلیبوں اور مورتوں کو نقصان نہیں پہنچایا جائیگا، (۱۱) ان سے عشر نہیں لیا جائیگا (۱۲) ان کے ملک میں فوج نہ بھیجی جائیگی (۱۳) پہلے سے ان کا جو مذہب اور عقیدہ تھا، وہ بدلوایا نہیں جائیگا (۱۴) ان کا کوئی حق جو ان کو پہلے سے حاصل تھا، زائل نہیں کیا جائیگا،

جو لوگ اس وقت حاضر نہیں ہیں یہ احکام ان کے لئے بھی شامل ہوں گے،

مولانا شبلی نے یہ بھی تحریر فرمایا کہ ان قوانین پر خلافت راشدہ کے زمانہ میں برابر عمل رہا، حضرت علیؓ فرمایا کرتے تھے کہ جو لوگ ذمی ہو چکے (یعنی جن لوگوں نے جزیہ دینا قبول کر لیا) ان کا خون ہمارا خون ہے، اور ان کا خون بہا ہمارا خون بہا ہے، مولانا شبلی نے اسی سلسلہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ اسلام نے جو انتظام قائم کیا اس کے رو سے ہر مسلمان خدمت کے لئے مجبور کیا جا سکتا ہے، لیکن غیر مسلم جو اسلامی حکومت کے ماتحت ہوتے ہیں ان کی حفاظت مسلمانوں کو کرنی پڑتی ہے، ان کو فوجی خدمت پر مجبور کرنے کا اسلام کو کوئی حق نہیں ہے، نہ وہ لوگ ایسی پرخطر خدمات

کے لئے راضی ہو سکتے ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی محافظت کے لیے کوئی معاوضہ دیں،
اسی معاوضہ کا نام جزیہ رکھا، اگر کسی موقع پر غیر قوم فوج میں شریک ہوتا یا شرکت کے لئے
آمادہ ہونا گوارا کر لیں تو وہ جزیہ سے بری کر دیئے جائیں، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم
نے والی ایلہ کو جو فرمان جزیہ کا تحریر فرمایا اس میں یہ الفاظ مندرج فرمائے، یحفظوا
ویمنعوا یعنی ان لوگوں کی حفاظت کی جائے اور دشمنوں سے بچائے جائیں، (مقالات
شبلی جلد اول مذہبی، ص ۱۹۲، ۱۹۴، ۲۳۱، ۲۳۲)

جزیہ کی اس نوعیت کو سمجھنے کے بعد یہ ٹیکس قابل مذمت قرار نہیں دیا جا سکتا، یہ تو
انسانی حقوق کا ضامن بن جاتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس وضاحت کے ساتھ جزیہ
کی اصلیت کو عام طور سے سمجھانے کی کوشش نہیں کی گئی، اسی لئے یہ شک و شبہ کی نظر
سے دیکھا جاتا رہا، اس سلسلہ میں موجودہ دور کے ایک مورخ ایشوری ٹوپا کا حسب ذیل
تجزیہ بالکل صحیح ہے جس سے صحیح عقیدہ کا کوئی مسلمان بھی اختلاف نہیں کر سکتا ہے،

"جزیہ اس ٹیکس کو کہتے تھے، جو اسلامی حکومت اپنی غیر مسلم رعایا سے اس خدمت
کے معاوضہ میں وصول کرتی کہ وہ ہندوؤں کے سیاسی، معاشرتی اور مذہبی حقوق کی
حفاظت کرتی ہے جزیہ لینے کے بعد ریاست ذمہ دار ہوتی ہے کہ کوئی ذمی کسی حیثیت
سے بھی نہ ستایا جائے، اور وہ بالکل محفوظ و مصئون زندگی بسر کرے، اس کو سرکاری
ملازمت حاصل کرنے کا پورا حق حاصل ہو، اور وہ مذہبی و معاشرتی مراسم کے ادا کرنے
میں بالکل آزاد ہو، جزیہ لینے کے بعد اسلامی ریاست ہر طرح سے ذمیوں کے جان
و مال کی نگرانی کرتی تھی، اور اسلامی فوج جنگ کے موقع پر اور دوسرے نازک موقعوں
میں ان کی پوری حفاظت کرتی تھی، اور ایسا کرنا اس کے مذہبی فریضہ میں داخل تھا،

ذمیوں سے جو جزیہ وصول کیا جاتا، وہ گویا اس خون کی قیمت ہوتی جو مسلمان ذمیوں کی
مدافعت میں بہاتے تھے، اگر کوئی اسلامی ریاست ذمیوں کی حفاظت کرنے سے قاصر ہو جاتی
تو اس کو جزیہ وصول کرنے کا بھی حق نہ رہ جاتا، اسلامی تاریخوں میں ایسی بہت سی مثالیں
ہیں کہ جب کوئی ریاست ذمیوں کی نگہبانی کرنے سے مجبور ہو گئی، تو جزیہ کی رقم ان کو واپس
کر دی گئی، ذمیوں کو اپنی خواہش سے فوج میں داخل ہونے کا پورا حق حاصل تھا،
لیکن جزیہ ادا کرنے کے بعد وہ جبری بھرتی سے مستثنیٰ کر دیئے جاتے تھے، لیکن اگر
اپنی مرضی سے وہ فوج میں بھرتی ہو جاتے تو جزیہ معاف کر دیا جاتا، جزیہ ذمیوں
کے بالغ مردوں سے لیا جاتا، جو جسمانی حیثیت سے تندرست اور دماغی اعتبار سے
صحیح ہوتے، اور جزیہ کی رقم ادا کرنے کی استطاعت بھی رکھتے، جزیہ ادا کرنے اور لینے
میں باہمی سمجھوتہ بھی ہو جاتا، پھر جزیہ متمول طبقہ سے ۴۸ درہم، متوسط لوگوں سے ۲۴ درہم
اور غریبوں سے ۱۲ درہم لیا جاتا تھا، بوڑھے، عورتیں، فاتر العقل، فقیر، اندھے، اپاہج
اور راہب جزیہ سے مستثنیٰ تھے، البتہ دولت مند اندھوں، اپاہجوں اور راہبوں سے
لیا جاتا تھا، جزیہ نقد اور جنس دونوں میں ادا کیا جا سکتا تھا، مسلمان فقہاء سیاسی ضروریات
کے مطابق جزیہ کے معانی و مطالب میں رد و بدل کرتے رہے، اور وہ جزیہ کی اصل
غرض و غایت کو نظر انداز کر کے اس کو مسلم ریاست کے سیاسی مفاد کے لئے استعمال
کرتے رہتے تاکہ غیر مسلم رعایا بالکل اختیار اور قابو میں رہے، اہل تحقیق کا خیال ہے
کہ بعض فقہاء نے جزیہ کا غلط استعمال کیا، قاسم الغازی نے کلام پاک کے ان مفسروں
کی سخت نکتہ چینی کی ہے، جنھوں نے کلام پاک کی آیت ۹، ۲۹ کی عجیب و غریب تفسیر
کر کے فضول گوئی سے کام لیا ہے، اور ان آیات قرآنی کے متعصبانہ اور متشددانہ

معانی بتائے ہیں، قاسم الغازی کا خیال ہے کہ ان آیات قرآنی کا ہرگز یہ منشا نہیں، کہ ذمیوں کو سیاسی، اقتصادی، مذہبی اور اخلاقی حیثیت سے تابع بنا کر ان کو گری ہوئی حالت میں رکھا جائے، اسلام کے کسی قانون نے اس تشدد کی اجازت نہیں دی ہے، اگر کسی نے یہ تشدد کیا ہے تو اس کی ذمہ داری فقہا پر ہے، ہندوستان کے ازمنۂ وسطیٰ میں سرکاری اور فوجی ملازمتوں میں اسی طرح داخل ہو سکتے تھے، جس طرح فیروز شاہ سے پہلے تو شاید ہندوؤں پر جزیہ لگایا بھی نہیں گیا، اس زمانہ کی تاریخی کتابوں میں جزیہ کا لفظ بہت کم استعمال ہوا ہے، اگر کہیں یہ عاید بھی کیا گیا تو اسلامی قانون کے مطابق اس پر عمل نہیں ہوا، کیونکہ خالص اسلامی طرز کی ریاست ہی قائم نہیں ہوئی۔ (دیانی نکس ان پری موغل ٹائمس ص ۱۴ - ۲۳۹)

فقہا کا اختلاف

یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کے پورے دور حکومت میں جزیہ صرف چند حکمرانوں ہی کے زمانے میں مقرر ہوا اور نہ اور مسلمان حکمرانوں نے خود طاق نسیاں ہی پر رکھنا پسند کیا، جو ان کی رواداری کی دلیل ہے، پھر بھی یہ اشتعال انگیز بنا رہا، اس اشتعال انگیزی میں زیادہ تر فقہا کا ہاتھ رہا، اسلامی تاریخ کا یہ المیہ ہے کہ علماء و فقہاء بہت کم کسی مسئلہ پر متفق ہونا پسند کرتے ہیں، اسی لئے ان کی اپنی اپنی تاویلوں سے بہت سے مسائل کی نوعیت بدل کر رہ جاتی ہے، چونکہ وہ بہت کم کسی مسئلہ پر متفق ہوتے، اس لئے مختلف زمانے میں فقہی مسائل کی تعبیریں بھی مختلف ہوتی رہتیں، مثلاً ضیاء الدین برنی کسی عالم یا کسی محدث کا قول نقل کرکے غیر مسلم رعایا کی زاری، لااعتباری اور بے مقداری کی تلقین کرتے رہے، (برنی ص ۲۹۷) سندھ کے فاتح محمد بن قاسم کو حجاج نے جو ہدایت دی تھی، اس میں تو غیر مسلموں کے ساتھ

خواری اور رسوائی کی تعلیم نہ تھی، کچھ ایسے علماء بھی پیدا ہوتے رہے، جو بڑی جرات کے ساتھ کسی قسم کے ناروا سلوک کے خلاف احتجاج کرتے رہے، مثلاً سکندر لودی کے زمانہ میں کشتر کے تالاب میں ہندو بکثرت جمع ہوتے، اور اشنان کرتے تھے، سکندر لودی نے چاہا کہ اس کنڈ کو تباہ کرکے اس اجتماع کو روک دے، اس زمانہ کے ایک عالم مولانا عبداللہ سے استفسار کیا، تو انھوں نے جواب دیا کہ قدیم رسم کا روکنا اور قدیم بت خانہ کو منہدم کرنا بالکل جائز نہیں، سکندر کو یہ جواب پسند نہ آیا، وہ سمجھا کہ طرفداری کا فتویٰ ہے، اپنی برہمی کا اظہار کیا، لیکن انھوں نے بڑی جرأت اور صفائی سے فرمایا کہ میں نے شریعت کا مسئلہ بیان کر دیا اگر شریعت کی پروا نہیں، تو پھر پوچھنے کی ضرورت ہی کیا تھی، اس جواب کے بعد سکندر لودی کو دبنا پڑا (واقعات مشتاقی ص ۱۵)

دل آزاری سے پرہیز

ہندوؤں کے خلاف مولانا ضیاء الدین برنی کی محرور المزاجی اس لحاظ سے بھی تعجب خیز ہے، کہ وہ خانوادۂ چشتیہ سے منسلک ہو کر، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے مرید تھے، چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں اور تمام صوفیائے کرام نے یہاں کے باشندوں کے دلوں کے تسخیر کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی، پھر ان کی تعلیمات بھی ایسی رہیں کہ ان کے یہاں دل آزاری اور مردم بیزاری کی گنجائش ہی نہیں تھی، ہندوستان میں تصوف پر سب سے پہلی کتاب کشف المحجوب لکھی گئی، جو تصوف کی انجیل سمجھی جاتی ہے، اس میں ایک صوفی کی تعلیم و تلقین کے لئے یہ ہدایت لکھی گئی ہے، کہ جب ایک صوفی کو گدڑی پہنائی جائے، تو اس سے ایک سال خلق کی خدمت ضرور لی جائے، خلق کی خدمت یہ ہے کہ وہ سب کو بلا تمیز اپنے سے بہتر جانتا ہو، اور ان کی خدمت اپنے لئے واجب سمجھتا ہو، مگر اپنی خدمت کا گمان مطلق نہ کرتا

ہو، (بزم صوفیہ از خاکسار مقالہ نگار ص ۲۰) حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی تعلیم یہ تھی کہ
کہ راہ سلوک میں جو کبیرہ گناہ ہیں، ان میں ایک مردم آزاری بھی ہے (بزم صوفیہ ص ۵۴)
حضرت فرید الدین گنج شکرؒ عبادت و ریاضت کے بعد صرف خلق اللہ کی خدمت ہی کی
فکر زیادہ رکھتے، کوئی سرکاری عہدہ دار ظلم کرتا تو اس کو ظلم سے منع کرتے، بے قصوروں
کو سزا سے بچاتے، کوئی فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتا، تو اس کو صحیح راستہ پر لگاتے، اس کے
اخلاق کو درست کرنے کی کوشش کرتے (ایضاً ص ۱۷۰، ۱۶۹) حضرت خواجہ نظام الدین
اولیاء خدا کی کسی مخلوق سے عناد رکھنا طریقت کے خلاف سمجھتے تھے، (ایضاً ص ۱۸۰) وہ فرماتے
کہ قیامت کے بازار میں کسی سودے کی اتنی قیمت اور پوچھ نہ ہوگی، جتنی دلداری، اور
دل خوش کرنے کی (سیر الاولیاء ص ۱۲۸) ان کے مرشد خواجہ فرید الدین گنج شکر نے ان کو اپنے
یہاں سے رخصت کرکے دہلی بھیجا، تو فرمایا تم ایک سایہ دار درخت ہو، جس کی چھاؤں
میں اللہ کی مخلوق آرام پائے گی، خواجگان چشت کی یہی کوشش رہی کہ وہ اپنے
اخلاص کی گھنی چھاؤں میں اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق کو پناہ دیتے رہیں، (سیر الاولیاء ص ۴۷)
حضرت شرف الدین یحییٰ منیری کی تعلیم یہ تھی کہ بادشاہ کے لئے نفل نماز اور نفل
روزے سے زیادہ ضروری ہے کہ وہ بھوکوں کو پیٹ بھر کھلائے، طرح طرح کے کپڑے
سلوائے، ننگوں کو پہنائے، اجڑے دلوں کو آباد کرے، حاجتمندوں کی دستگیری کرے
ان کا قول تھا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں پہنچنے کی راہیں تو بہت ہیں، لیکن سب سے نزدیک
راہ دلوں کو راحت پہنچانا ہے، (مکتوبات صدی ص ۴۸۹) حضرت اشرف جہانگیر
سمنانی کی تعلیم یہ تھی کہ رعیت پر ظلم کرنے سے جہانداری اور شہریاری کو نقصان پہنچتا ہے،
(لطائف اشرفی ج ۲ ص ۱۶۸، ۱۶۷) ان کی یہ بھی تلقین تھی کہ دعا کی نگہبانی ہی میں

ملک کے مصالح اور رعایا کی بہبود پنہاں رہتی ہے (ایضاً ص ۱۱۳) حضرت خواجہ سید محمد
گیسو دراز نے گلبرگہ کے سلطان احمد شاہ بہمنی کو یہ تعلیم دی کہ وہ فقیروں، کمزوروں،
یتیموں، عاجزوں، لنگڑوں اور بیواؤں کی پوری خبرگیری کرے، ان کو برباد ہونے سے
بچا لینے سے زیادہ کوئی مشکل کام نہیں (خاتمہ ص ۱۹۰-۱۸۷)

عدل نوازی

ہندوستان کے مسلمان فرماں رواؤں کا سب سے نمایاں شیوہ یہ رہا تھا کہ
وہ عدل و انصاف پر پورا زور دیتے رہے، وہ فاسق، فاجر اور شرابی ہونے کا الزام
تو گوارا کر لیتے، لیکن ظالم، غیر عادل، اور غیر منصف ہونے کا الزام کسی طرح پسند نہ کرتے
فخر مدبر کا بیان ہے کہ قطب الدین ایبک عدل پر حضرت عمرؓ کی تقلید کرتا تھا، التمش نے
اعلان کر رکھا تھا کہ جس کسی پر ظلم ہو، وہ اس کے محل کے عدل و انصاف کی لگی ہوئی
زنجیر کو ہلائے تاکہ وہ اس کے ساتھ انصاف کر سکے، ورنہ قیامت کے روز ان کی فریاد
کا بار اس کی طاقت برداشت نہ کر سکے گی، (فوائد السالکین ص ۲۹) غیاث الدین بلبن
کے بارے میں مورخ ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ وہ داد و دہش اور انصاف پروری
میں بھائیوں، لڑکوں اور مقربوں کا مطلق لحاظ نہ کرتا، اور جب تک مظلوم کے ساتھ انصاف
نہ کر لیتا، اس کے دل کو آرام نہ پہنچتا (برنی ص ۴۰) اس کے عدل و انصاف کے قصے
بہت مشہور ہیں، تاریخ مبارک شاہی، اور ملا عبد القادر بدایونی دونوں میں ہے کہ
سلطان محمد تغلق نے اپنے شاہی محل کے اندر چار مفتی مامور کر رکھے تھے، کہ جب کوئی
فریادی آتا تو سلطان ان مفتیوں سے مشورہ کرتا، اور ان کو تنبیہ کر رکھی تھی کہ اگر
کوئی معصوم اس کے فیصلہ کی بدولت تہ تیغ ہوا تو اس کا خون ناحق ان کی گردن پر
ہوگا، اس لیے مفتیوں سے کوئی فروگذاشت نہ ہوتی، (تاریخ مبارک شاہی ص ۱۱۵)

منتخب التواریخ جلد اول ص ۲۳۹)

ظاہر ہے کہ خلق اللہ کی خدمت، مردم آزاری، رعیت پر ظلم کرنے سے پرہیز، بھوکوں ننگوں اور حاجتمندوں کی دست گیری کرنے میں مسلم اور غیر مسلم دونوں کا دائرہ ہوتا، اور عدل و انصاف میں تو مذہب، ذات پات کی کوئی تفریق نہ کی جاتی، حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے سلطان فیروز شاہ تغلق کو اس حدیث کی پوری تفصیل لکھ بھیجی، جس میں ابو جہل کے مقابلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نصرانی کی حمایت کی، ابو جہل نے ایک نصرانی کا مال غصب کر لیا تھا، اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر اس وقت فریاد کی جب آپ دوپہر کی سخت گرمی میں قیلولہ فرما رہے تھے، آپ اسی وقت نصرانی کے ساتھ ابو جہل کے مکان پر تشریف لے گئے، اس کا دروازہ کھٹکھٹایا، اس کو غصہ آیا، مگر آپ اس وقت تک اس کے دروازے سے نہیں ہٹے جب تک نصرانی کا سارا مال ابو جہل نے واپس نہیں کیا، نصرانی کو اس کا ایک تھیلا نہ ملا تو ابو جہل نے اس سے ایک بہتر تھیلا لا کر دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نصرانی سے پوچھا کہ یہ تھیلا بہتر ہے یا وہ بہتر تھا، تو اس نے کہا یہ بہتر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم یہ کہتے کہ وہ بہتر تھا تو میں اس وقت تک واپس نہ جاتا، جب تک میں قیمت لیکر تمھارے حوالہ نہ کرتا (مکتوبات سہ صدی ص ۳۹۲-۴۹۳)

یہ حدیث اس بات کی کھلی تلقین ہے، کہ اسلام میں عدل و انصاف کرنے میں مسلم و غیر مسلم کی تفریق نہ ہو، مظلوم کسی مذہب یا فرقہ کا ہو، اس کے ساتھ انصاف ہونا چاہئے، حضرت شرف الدین یحییٰ منیری نے سلطان فیروز شاہ تغلق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیثیں بھی لکھ بھیجی تھیں، کہ جو کوئی کسی مظلوم کو دیکھتا ہے، اور وہ مظلوم

اس سے فریاد کرتا ہے، لیکن وہ فریاد نہیں سنتا، تو قبر کے اندر اسکو آگ کے سو کوڑے مارے جائیں گے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک ساعت کا عدل ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے، حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ خوش رہے کہ سلطان فیروز شاہ کی ذات مظلوموں اور درماندوں کی جائے پناہ ہے، (مکتوبات سہ صدی ص ۴۹۳-۴۹۴)

تسخیر قلوب تمام صوفیائے کرام مسلمان فرمانرواؤں کو عدل و انصاف کی تلقین کرتے رہے، اور پھر وہ خود یہاں کے غیر مسلموں کے ساتھ جس پاکیزہ اور بلند اخلاق سے پیش آتے رہے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے اخلاق کی بلندی اور پاکیزگی سے متاثر ہو کر یہاں کے غیر مسلم دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے رہے، جس کی ایک علیحدہ داستان ہے، مگر یہ حقیقت ہے کہ جب سلاطین تخت و تاج کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ فوج کشی میں مشغول تھے، تو خانقاہ کے بوریا نشین انسانوں کے قلوب کی تسخیر میں لگے ہوئے تھے، اور یہ تسخیر ان کے روادارانہ زہد، عبادت، تفکر، اخلاص اور محبت کے ذریعہ سے ہو رہی تھی، جس کو اس زمانہ کے اہلِ قلم پوری تفصیل سے قلم بند کر دیتے، تو ہندوستان میں اسلام کی تاریخ کچھ اور ہی نظر آتی، ہندوؤں میں جو ذات پات کی تفریق تھی اس سے ان کا ایک بڑا طبقہ کچھ ایسا نالاں تھا کہ جب ان صوفیائے کرام نے مساوات، رواداری، حقانیت اور انسانیت نوازی کی تعلیم دیکر اپنی روحانی کشش کے جلوے دکھائے تو یہاں کے ان لوگوں کی نگاہوں میں جن کو یہاں کے سماجی نظام نے کچل رکھا تھا، اسلام کی معاشرتی، مذہبی اور روحانی جاذبیت کی نشانیاں گذرنے لگیں، جس کے بعد وہ اسلام کی طرف خواہ مخواہ مائل ہونے لگے،

امیر خسرو کی رواداری چشتیہ سلسلہ کے روادارانہ تعلیمات کی روشن مثالیں حضرت

امیر خسرو اور امیر حسن سجزی کے یہاں ملتی ہیں، دونوں حضرات خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے حلقۂ بیعت میں داخل تھے، پہلے کہا گیا ہے، کہ تعجب تو یہ ہے، کہ مولانا ضیاء الدین برنی بھی حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مرید تھے، مگر انھوں نے اپنی محرومی المزاجی کی وجہ سے جو تحریریں لکھیں، ان سے یقیناً اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کو نقصان پہنچا، لیکن ان کے زہر کا تریاق حضرت امیر خسرو اور امیر حسن سجزی کی تحریروں میں ملتا ہے، جو برنی ہی کے زمانہ میں نیک نفسی، فراخ دلی، وسیع المشربی اور کشادہ ذہنی کا درس دے رہے تھے، امیر خسرو ہی کی روایت ہے کہ ایک مسلمان حج کے لئے مکہ معظمہ جا رہا تھا کہ راستہ میں ایک برہمن ملا، جو سومناتھ جا رہا تھا، یہ برہمن اپنے عقیدہ کی شدت میں زمین پر لیٹ لیٹ کر ناپتا جاتا، حاجی نے برہمن سے پوچھا دوست تم کہاں جا رہے ہو، برہمن نے کہا میں تو کئی سال سے اسی طرح سفر کر رہا ہوں، حاجی نے کہا خدا نے تم کو دو پاؤں دیئے ہیں، تو چلنے کے بجائے اپنے سینہ کے بل کیوں رینگ رہے ہو، برہمن نے جواب دیا جب سے میں نے اپنی جان مورتی کے حوالے کر دی ہے، اسی طرح سینہ کے بل رینگ رہا ہوں (مثنوی مطلع الانوار ص ۸۸۔۸۷) امیر خسرو لکھتے ہیں کہ ہندو بت پرستوں پر طنز کیا جاتا ہے، لیکن ان کے عقیدہ میں جو اخلاص ہے، اس سے سبق لیا جا سکتا ہے، اسی کو اپنے ایک شعر میں اس طرح کہتے ہیں،

اے کہ زبت طعنہ بہ ہندو بری — ہم زوے آموز پرستش گری

وہ اپنی مثنوی دول رانی خضر خاں میں لکھتے ہیں کہ ایک آتش پرست ہندو سے سوال کیا گیا کہ وہ آگ کی پرستش کیوں کرتا ہے، اور اس کے لئے کیوں جان دیتا ہے، اس نے جواب دیا کہ آگ کو دیکھ کر امید وصل فروزاں رہتی ہے اور آگ میں فنا ہو کر بقا ملتی

ہوتی ہے، امیر خسرو نے آگ کی پرستش کی تو نہیں لیکن اس آتش پرست کے جذبہ کی قدر کرنے کا مشورہ دیا ہے، (مثنوی دول رانی خضر خاں ص ۱۹۲-۱۹۵)

امیر خسرو کا اپنا مذہب تو اسلام تھا، اس لئے ہندومت کو اس پر کسی طرح ترجیح دینا پسند نہ کرتے، لیکن اپنے ہم وطن بھائیوں کی دلجوئی اور دلداری کی خاطر ان کے مذہب کو دنیا کے اور تمام مذاہب سے بہتر سمجھنے کے لئے تیار ہو گئے، ہندو مذہب کو اپنے دلائل سے ثنویہ، عیسائیت، قوم مجسم، ستارہ پرست، عنصریوں، قوم مشبہہ اور قوم پارسی سے بہتر قرار دیا ہے، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ہندو پتھر، جانور، آفتاب اور درخت کو ضرور پوجتے ہیں، لیکن ان کی پرستش میں اخلاص ہے، اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب ایک ہی خالق کی مخلوق ہیں، اس کی اطاعت کے منکر نہیں، ان چیزوں کی پوجا اس لئے کرتے ہیں کہ ان کے آباء و اجداد ان کی پوجا کرتے آئے ہیں، امیر خسرو البیرونی کی طرح ہندوؤں کے تصور وحدانیت کے بھی معترف رہے، لکھتے ہیں، کہ ہندو ہمارے مذہب کے قائل نہیں، لیکن ان کے بہت سے عقائد ہم سے مشابہ ہیں، وہ خداوند تعالیٰ کی وحدت، اس کی ہستی، اور قدم کے قائل ہیں، اس کی قدرت ایجاد، اور اس کے رازق، خالق، فعال، فاعل، مختار اور عالم جزو کل کے قائل ہیں، امیر خسرو نے یہ باتیں اپنی مثنوی نہ سپہر (ص ۱۶۴) میں اس طرح لکھی ہیں،

معترف وحدت و ہستی و قدم — قدرت ایجاد ہمہ بعد عدم

رازق ہر پر ہنر و بے ہنرے — عزبر جاں دہ ہر جانورے

خالق افعال بہ نیکی و بدی — حکمت و کنش ازلی و ابدی

فاعل مختار و مجازی بہ عمل — عالم ہر کلی و جزوی زازل

دیں ہمہ را گشت بہ تحقیق مقر — نے چو بسے طائفہ بر کذب مصر

ہندو مرد اور عورت میں وفا شعاری کا جذبہ ہوتا ہے، اس سے بھی امیر خسرو متاثر ہوئے، لکھتے ہیں کہ ہندو اپنی وفاداری میں تلوار اور آگ سے اپنی جان دے سکتا ہے، اور ایک ہندو عورت اپنے شوہر کی خاطر جل کر راکھ ہو جاتی ہے، ہندو مرد اپنے بت اور مالک کے لئے اپنی جان بھینٹ چڑھا دیتا ہے، اسلام نے ان چیزوں کو روا نہیں رکھا ہے، لیکن یہ بڑی کارگذاری ہے، اگر ہماری شریعت میں اس کی اجازت ہو تو بہت سے لوگ اس سعادت کو حاصل کرنے میں اپنی جانیں قربان کریں،

گرچہ در اسلام روا نیست چنیں — لیک چو بس کار بزرگ بہ بیں

گر بہ شریعت بود ایں نوع روا — جاں بدہند اہل سعادت سوا

امیر خسرو تو ہندوؤں کی ہر چیز کو محبوب رکھتے، لکھتے ہیں کہ دانش و معانی ہندوستان میں اندازہ سے باہر ہے، یونان حکمت میں مشہور ہے، لیکن ہندوستان اس میں بھی تہی مایہ نہیں، یہاں منطق بھی ہے، اور نجوم بھی، اور علم کلام بھی، البتہ ہندو فقہ سے واقف نہیں ہیں، لیکن وہ طبیعیات، ریاضیات اور ہیئت کے ماہر ہیں وغیرہ (مثنوی نہ سپہر ص ۷۲-۱۶۱) سنسکرت زبان کی تعریف تو بار بار کی ہے، لکھتے ہیں عربی کے علاوہ اس کو تمام زبانوں پر فوقیت حاصل ہے، (مثنوی دول رانی خضر خاں ص ۴۳-۴۲)

پھر ہندوستان کی آب و ہوا، پھولوں، میووں، کپڑوں، جانوروں، پان، یہاں عورتوں کے حسن کی تعریف میں ان کا قلم بڑا رواں دواں رہا ہے، وہ تو یہاں تک لکھ گئے ہیں کہ شوخ اور سادہ حسین ہندو محبوبوں کی وجہ سے مسلمان بھی سورج کے پجاری ہو سکتے ہیں، یہاں کے مغ بچوں کو دیکھ کر خسرو کہتے ہیں کہ وہ خود خراب اور سرمست

ہو گئے ہیں، (قران السعدین ص ۳۴-۱۳۶)

خورشید پرست شد مسلماں — زیں ہندوگان شوخ و سادہ

کردند مرا خراب و سرمست — ایں مغ بچگان تاک زادہ

مزید تفصیلات کے لئے راقم کی کتاب "ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں" مطالعہ کی جا سکتی ہے،

امیر خسرو کے مرشد حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء (المتوفی ۱۳۲۴ء) تھے، جن کے ایک بھانجے مولانا تقی الدین نوح تھے، حضرت خواجہ ان کو بہت محبوب رکھتے تھے، ان کا انتقال عین شباب میں ہو گیا، حضرت خواجہ کو اس سے بڑا صدمہ پہنچا، چھ مہینے تک ان پر سکوت طاری رہی، اس سے امیر خسرو بھی مغموم رہتے تھے، اور برابر اس فکر میں رہتے تھے، کہ کس طرح مرشد کا غم غلط ہو، اس زمانہ میں ہندوؤں کا بسنت کا میلہ لگا، وہ دہلی میں کالکاجی کے مندر پر سرسوں کے پھول چڑھا رہے تھے، اور مست ہو کر ترانے الاپ رہے تھے، امیر خسرو بھی اس منظر کو دیکھ کر بے خود ہو گئے، فارسی اور ہندی کے چند اشعار اسی وقت موزوں کئے، سرسوں کے پھول توڑے، اور پگڑی کو کج کر کے مستانہ شان پیدا کی، جھومتے جھامتے اشعار پڑھتے حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، جو اس وقت اپنے بھانجے کے مزار پر تھے، امیر خسرو کی مستانہ ادا دیکھ کر اور ان کے اشعار سن کر مسکرانے لگے، پھر تو امیر خسرو کا کام بن گیا، اس روز سے دہلی میں جب ہندو کالکاجی کے مندر پر جاتے تو دہلی اور قرب و جوار کے صوفیہ قوالوں کو لیکر سرسوں کے پھول ہاتھ میں لئے، اشعار پڑھواتے ہوئے مولانا تقی الدین کے مزار پر جاتے، وہاں سے حضرت خواجہ کے مزار پر آتے، ان اشعار میں ایک شعر یہ بھی ہے،

اشک ریز آمدست ابر بہار ساقیا گل بریز و بادہ بیار

قوال ہندی کی ٹھمریوں کو پڑھ پڑھ کر اسی شعر کو بار بار دہراتے، ہندی کا ایک مصرع یہ ہے:

عرب یار توری بسنت منائی

یہ پڑھا جاتا، تو بڑا اثر پیدا ہوتا، رفتہ رفتہ دہلی کی درگاہوں میں پندرہ دن تک بسنت کا میلہ رہنے لگا، دوسری جگہوں پر بھی مسلمان بسنت منانے لگے. بسنت کے موقع پر امیر خسرو کا ایک گیت ان کی طرف اس طرح بھی منسوب ہے،

حضرت خواجہ سنگ کھیلے دھمال

بائیس کھاجہ مل بن بن آیو ناس حضرت رسول صاحب جمال

حضرت خواجہ سنگ کھیلے دھمال

عرب یار تیرو بسنت منائیو سدا رکھئے لال گلال

حضرت کھاجہ سنگ کھیلے دھمال

خواجہ نظام الدین اولیاء کی فراخدلی

امیر خسرو کو یہ رواداری اور فراخدلی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی تربیت اور صحبت ہی میں حاصل ہوئی جن کے یہاں خلق اللہ کی ایذا رسانی اور دل آزاری سب سے بڑا اخلاقی گناہ اور جرم تھا، حضرت خواجہ خود بھی ہندوؤں کی بعض باتوں کو دیکھ کر متاثر ہو جاتے، ایک روز وہ اپنی خانقاہ سے باہر امیر خسرو کے ساتھ نکلے تو جمنا کے کنارے ہندو عورتیں اور مرد غسل کر رہے تھے، ان کو دیکھ کر حضرت خواجہ نے فرمایا،

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

(تزک جہانگیری ص ۸۲)

حضرت خواجہ برہمنوں کی بعض خوبیوں کے بھی معترف رہے، ان کے چہیتے خلیفہ امیر حسن دہلوی (المتوفی ۱۳۳۵ھ) ان کے ملفوظات قلمبند کیا کرتے تھے، جو فوائد الفواد کے نام سے اب تک بہت مشہور اور مقبول ہے، وہ بھی امیر خسرو کی طرح شاہی دربار سے وابستہ رہے، وہ لکھتے ہیں، کہ ایک بار ان کو شاہی دربار سے کچھ دنوں تک تنخواہ نہیں ملی جس سے وہ پریشان تھے، حضرت خواجہ کو ان کی پریشانی معلوم ہوئی تو امیر حسن کو یہ شکایت سنائی، کہ ایک شہر میں ایک برہمن رہتا تھا، اس کے پاس بڑی دولت تھی، لیکن اس شہر کے حاکم نے اس پر جرمانہ کر کے اس کا سارا مال و اسباب ضبط کر لیا، جس سے وہ تباہ و برباد ہو کر بہت ہی مفلس ہو گیا، ایک روز وہ کہیں جا رہا تھا کہ اس کا ایک دوست راستہ میں ملا، اس نے برہمن سے پوچھا تمہارا کیا حال ہے، برہمن نے جواب دیا، اچھا ہے، اور خوش ہوں، دوست نے کہا کہ تمہاری چیزیں تو تم سے لی گئیں، اب تم خوش کیسے رہ سکتے ہو، برہمن نے جواب دیا میرا جنیو تو میرے پاس ہے،

زنار من با من است

حضرت خواجہ نے یہ حکایت سنا کر امیر حسن سے کہا "تم نے سنا"، امیر حسن نے جواب دیا، "جی ہاں، اس حکایت سے مجھ کو بڑی باطنی تسکین اور تسلی ہوئی، (فوائد الفواد ص ۲۵۹)،

حسن دہلوی کی رواداری

امیر حسن دہلوی کے دیوان میں بہت سی ایسی منظوم حکایتیں ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہم مذہبوں کو رواداری اور فراخدلی کی تعلیم دیتے رہے، ایک نظم میں لکھتے ہیں کہ ایک کشتی پر ایک غیر مسلم (گبر) اور "نناوے" مسلمان سوار تھے، یکایک کشتی دریا میں ڈوبنے لگی، مسلمانوں نے کہا کہ ہم تو خداوند تعالیٰ کے نور سے آشنا ہیں، لیکن کسی بیگانہ کی وجہ سے یہ کشتی ڈوب رہی ہے، اس لئے اس گبر کو دریا میں ڈال کر

کشتی کو محفوظ کر لینا چاہیے، گبر نے یہ سنا تو نا امید ہو کر ایک آہ کھینچی، اور بولا کہ ایک گبر کی بدبختی کی تاثیر سے بلا آرہی ہے، اور کشتی ڈوب رہی ہے، تو پھر تم نے مومنوں کی پاکی سے یہ محفوظ کیوں نہیں ہے، ان میں ایک دانا بزرگ بھی تھے اگبر کی یہ دردناک بات سن کر متاثر ہوئے اور اپنے ساتھیوں کو نصیحت کی کہ ہر حال میں خداوند تعالیٰ کی رضا اور دستگیری پر بھروسہ کرنا چاہیے، اس کے بعد کشتی سلامت رہی، آخر میں امیر حسن لکھتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ کے ملک بے نیازی میں سرانداز ہی میں سرافرازی ہے اور دوسروں کے فسق پر نظر رکھنا درست نہیں، ہر حال میں خدا سے خیر اور ظلمت کے چراغ کی روشنی میں فضل الٰہی کی امید رکھنی چاہیے، میر حسن دہلوی نے اس واقعہ کو اس طرح منظوم کیا ہے، (دیوان حسن سنجری ص ۲-۵۸۱)

شنیدم کشتی در موج گاہے   ہمی شد غرقہ نے رو دنہ راہے
در آں کشتی درا غلب اہل ایماں   یکے گبر و تو دنہ تن مسلماں
مسلمانان بر آشفتند کایں کار   ہم از ہم صحبتاں آمد پدیدار
چو نور آشنائی ہست بر ما   بلا زیں مرد بیگانست بر ما
بدریا افگنیم ایں گبر را زود   خلاص ما نخواہد جز چنیں بود
چو بشنید ایں سخن آں مرد گمراہ   برآورد از دل نومید خود آہ
پس آنگہ با مسلماناں چنیں رفت   کہ خار از راہ خود نے خود تواں رفت
گر از تاثیر شومی یکے گبر   بلا خیز د چہ تدبیر است جز صبر
چرا صدق نبود نہ مومن پاک   اثر نہ دہد در ایں حال خطرناک
در آنجا پیر دانا بود مردے   رسید اندر دلش زیں حرف دردے

بیاراں گفت بگذارید ایں رائے   بیفشارید در راہ رضا پائے
مبیں در جود دست ناکس و کس   دریں جا دستگیری خدا بس
دریں بودند کاواز بر آمد   کہ اینک روز محنت ہا سر آمد
زغرقاب آمد ایں کشتی بپایاب   علامت را نہیا گشت اسباب
حسن چوں ملک ملک بے نیاز ست   سر انداز ی دریں رہ سرفرازیست
صلاح خود مبیں و فسق غیرے   بہر حال از خدا می خواہ خیرے
خداوندا بحال ما نظر کن   دریں ظلمت چراغ فضل بر کن
ز ما خود جز پلیدی ہا نیاید   تو خود کن کز کریمی تو آید

حسن دہلوی نے ایک غیر مسلم کی قسمت و فیاضی کا حال بہت اچھے موثر انداز میں لکھا ہے، یہ غیر مسلم ضرورت مندوں اور محتاجوں کی مدد کرنے میں بہت مشہور تھا، ایک مسکین اس کے پاس اس وقت پہنچا جب وہ میدان جنگ میں زخمی ہو کر دم توڑ رہا تھا، مسکین نے اس کے پاس آکر اپنا حال بتایا تو اس نے کہا اب تو اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہا، اس کے دانتوں میں سونے کی ڈوری نکال کر اپنی ضرورت پوری کر سکتا ہے، یہ لکھ کر حسن دہلوی کہتے ہیں، (ایضاً ص ۵۸۳)

سخن در ہمت است وز ر افشانی   حساب کفر و ایماں را تو دانی
اگر فاسق سخائے ورزد اے دوست   حبیب اللہ طراز دولت اوست
و گر زاہد کند با بخل پیوند   خدایش دشمن و خلق صد چند

شیخ احمد عبدالحق کی روادارانہ حکایت

مذہبی رواداری کی ایک اچھی مثال پنڈوہ (بنگال) کے ایک مسلمان حاکم کے یہاں بھی ملتی ہے، جس کو شیخ عبدالقدوس گنگوہی نے شیخ

احمد عبد الحق کے ملفوظات کے سلسلہ میں بیان کیا ہے، شیخ احمد عبد الحق راہ سلوک کی منزلیں طے کرنے کے سلسلہ میں بنگال جاکر پنڈوہ میں مقیم ہوئے، تو اس زمانہ میں وہاں کا حاکم ایک رات بھیس بدل کر شہر میں نکلا، ایک جگہ قلندروں کی ایک جماعت کھانا کھا رہی تھی، حاکم ان کے پاس پہنچا تو انھوں نے اس کو پھٹکارا کہ تم ہمارے کھانے میں نظر لگا رہے ہو، اس نے اپنی غربت کا ذکر کیا تو وہ اور برہم ہوئے، اور جب تک اس کو اپنے سامنے سے ہٹا نہ لیا، خاموش نہیں ہوئے، حاکم وہاں سے ایک ایسی جگہ پہنچا، جہاں کچھ جوگی رہتے تھے، وہ لوگ بھی کھانا کھا رہے تھے، آپس میں برابر تقسیم کرنے لگے، تو ایک حصہ حاکم کو بھی دیا، حاکم نے کہا میں ایک بیگانہ آدمی ہوں، میرے لئے اس کا حصہ کیوں لگاتے ہو، جوگی بولے ہمارا طریقہ یہی ہے، اگر کتا موجود ہوتا ہے تو ہم اس کو بھی برابر کا حصہ دیتے ہیں، تم تو آدمی ہو، تم کو کیسے نہ دیں، حاکم یہ سن کر بہت متاثر ہوا، صبح کو اس نے حکم دیا کہ سارے قلندر اور درویش شہر بدر کر دیئے جائیں، جوگی جیسے تھے ویسے رہنے دیئے گئے، شہر میں ہنگامہ برپا ہوا، شیخ عبد الحق شہر چھوڑنا نہیں چاہتے تھے، وہ حاکم کی ڈیوڑھی پر جاکر بیٹھ گئے، کسی نے ان کو وہاں سے نہیں ہٹایا، تو یہ کہہ کر اپنی قیام گاہ پر واپس آگئے کہ یہ حاکم درویشوں کو نہیں بلکہ بے خبروں کو شہر بدر کر رہا ہے، (انوار العیون ص ۲۵-۲۳)

بہمنی خاندان کے بانی کی حکایت

رواداری کی ایک بہت اچھی مثال دکن کے بہمنی سلطنت کے بانی سلطان علاء الدین حسن گانگو بہمنی (المتوفی ۷۵۹ھ) کے یہاں بھی ملتی ہے، اس کی ابتدائی زندگی بہت ہی عسرت میں گذری، وہ دہلی میں محمد تغلق کی شہزادگی کے زمانہ میں اس کے ایک منجم گنگو برہمن کا ملازم تھا، اپنی تنگ دستی سے پریشان

رہتا، ایک دن اس نے گنگو برہمن سے اپنی غربت کا ذکر کیا، تو گنگو برہمن نے ہمدردی میں نواح دہلی میں اس کو اپنی بنجر زمین کا ایک ٹکڑا دیا، ایک جوڑی بیل اور دو مزدوروں کا بھی انتظام کر دیا، تاکہ وہ اس زمین پر کھیتی کر کے اپنا پیٹ پال سکے، ایک دن اسکے مزدور ہل چلا رہے تھے کہ زمین کے اندر سے ایک برتن نکلا جس میں سلطان علاء الدین خلجی کے عہد کی اشرفیاں تھیں، حسن اپنی ایمانداری کی وجہ سے یہ گوارا نہ کر سکا کہ آقا کی دی ہوئی زمین میں خیانت کرے، اس نے یہ ساری دولت گنگو برہمن کے سامنے لیجا رکھدی، گنگو نے حسن کی ایمانداری کا ذکر شہزادہ محمد تغلق سے کیا، اس نے اپنے باپ سلطان غیاث الدین تغلق کو اس کی خبر دی، سلطان غیاث الدین تغلق نے حسن کو اپنے حضور میں طلب کیا، اور شاہی نوازشوں کے ساتھ اپنے امیروں کے زمرہ میں شامل کر لیا، (تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۲۷۴) ایک دن گنگو برہمن نے حسن سے کہا کہ مجھ کو تمہاری قسمت کے زائچہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم بڑے اقبال مند ہوگے، خدا کی مدد اور عنایت سے کسی بلند رتبہ پر پہنچ جاؤ گے، اس بات کا عہد کرو کہ اگر خدا تم کو کسی بڑے مرتبہ پر پہنچا دے، تو میرا نام بھی اپنے نام کا جزو بنا لینا تاکہ تمہارے اقبال کی بدولت میں بھی دنیا میں زندہ رہ سکوں، دوسرے یہ کہ اپنے خزانہ میں مجھ کو اور میری اولاد کے سوا کسی اور کو نہ رکھنا، حسن نے اپنے محسن کی دونوں باتیں منظور کر لیں؛ اور کوئی بڑا عہدہ پانے سے پہلے ہی اپنے نام کے ساتھ گنگو بہمنی لکھنے لگا، وہ دکن میں بہمنی سلطنت قائم کرنے کے بعد بڑا کامیاب حکمراں اور فاتح ثابت ہوا، ایک بار کسی نے اس سے پوچھا آپ نے اتنی بڑی سلطنت کیسے حاصل کر لی اور کم مدت میں اتنی وسعت کیسے دی، اور دوسرے حکمرانوں اور رعایا کو اپنا مطیع کیسے بنایا، اس نے جواب دیا، کہ پہلے

تو میں نے مروت کو اپنا اصول بنایا، خواص و عوام سے ہمیشہ مروت سے پیش آتا رہا، دوسرے یہ کہ کبھی بخل سے کام نہیں لیا، سخاوت میں دوست اور دشمن کی تفریق نہیں کی، ہر ایک کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا، ان ہی دو باتوں کی وجہ سے سب ہی میرے مخلص ہمدرد اور مطیع بنتے گئے" (تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۲۸)

علمی رواداری

علمی رواداریاں تو ملک کے مختلف گوشوں میں برابر جاری رہیں، مثلاً بنگال میں بنگالی زبان ضرور بولی جاتی تھی، لیکن رامائن اور مہابھارت جیسے کلاسیکل لٹریچر سے ان کی زبان بیگانہ تھی، مسلمانوں کی حکومت وہاں قائم ہوئی، تو انھوں نے نہ صرف بنگالی زبان سیکھی، بلکہ اس کو باوزن بنانے کی پوری کوشش کی، سلطان ناصر شاہ (۱۲۸۲-۱۳۲۵) بنگالی زبان کا بڑا مربی تھا، شاعر اعظم ودیاپتی نے اپنی ایک نظم اس کے نام معنون کرکے اس کی شہرت کو باقی رکھا ہے، اسی کے حکم سے مہابھارت کا بنگالی ترجمہ ہوا، سلطان حسین شاہ نے مالادھر باسو کو بھاگوت پران کے بنگالی ترجمہ کے لئے مقرر کیا، حسین شاہ کے سپہ سالار پرگل خاں کے حکم سے کویندرا پرمیشور نے مہابھارت کا دوسرا ترجمہ شروع کیا، جسے سری کرن نندی نے آگے بڑھایا، (ڈیولپمنٹ آف لٹریچر ان انڈیا ڈیورنگ دی محمڈن پیریڈ از ان، ان لاس ص ۱۱۸-۱۰۷) آگے چل کر تو بنگالی زبان مسلمانوں کی مادری زبان ہو گئی، اور انھوں نے اس میں بیشمار کتابیں لکھیں،

صوفیائے کرام نے بھی ہندوستان کی تسخیر قلوب کے لئے یہاں کی زبانیں سیکھیں اور ان میں دوہے کہے، حضرت فریدالدین گنج شکرؒ (ف ۱۲۶۵ء) کے پنجابی اشعار بو علی قلندر پانی پتی (ف ۱۳۲۳ء) حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ (ف ۱۳۸۰ء) حضرت عبدالحق رودولویؒ (ف ۱۴۳۴ء) اور حضرت عبدالقدوس گنگوہی (ف ۱۵۳۷ء)

شیخ برناوی (ف) کے ہندی دوہے اور اشعار آج کل کی ہندی زبان کے محققوں کے لئے لائق توجہ ہوگئے ہیں، دکن میں خواجہ گیسو دراز (ف ۱۴۲۲) نے معراج العاشقین اور شاہ میراں شمس العشاق (ف ۱۴۲۲) نے خوش نامہ، خوش نغز اور شہادۃ الحقیقۃ وغیرہ دکنی زبان میں لکھ کر یہ صور پھونکا کہ مسلمان فارسی زبان چھوڑ کر یہاں کی ملکی زبان کو اپنائیں، صوفیائے کرام نے یہاں کے باشندوں سے قریب تر ہونے کے لئے فارسی اور عربی زبانوں کو چھوڑ کر جس طرح ان کی زبان اختیار کی اور اس سے اردو کی جو نشو و نما ہوئی، وہ نہ صرف رواداری بلکہ ہندوستان کی مذہبی اور لسانی تاریخ کا مستقل باب بن گیا ہے،

سلطان زین العابدین کی رواداری

کشمیر میں سلطان زین العابدین (۱۴۲۰ - ۱۴۷۰) کو فارسی کے علاوہ ہندی اور تبتی زبان پر بڑا عبور حاصل تھا، اس نے اپنی سیاسی رواداری کے ساتھ علمی بے تعصبی کی سرگرمیاں بھی جاری رکھیں، اس کو سنسکرت کے فضلا میں جون راج اور سری ور پر بڑا اعتماد تھا، ان دونوں نے اسی کے ایما سے سنسکرت میں کشمیر کی تاریخیں لکھیں، سلطان کا ایک اور درباری بودھ بھٹ ویدول کا عالم تھا، اس نے کشمیری نظم میں ایک ڈراما جین پرکاش لکھا، جس میں اپنے آقا کے دور حکومت کی تفصیل لکھی ہے، ایک اور شاعر سوم پنڈت نے اپنی کشمیری نظم جین چرت میں سلطان کے کارناموں کا ذکر کیا ہے، ایک اور مصنف بھٹ اوتار نے جین ولاس لکھی، جس میں سلطان کے مقولے ہیں، سلطان نے ایک دارالترجمہ بھی قائم کر رکھا تھا جس میں فارسی کی کتابیں سنسکرت میں اور سنسکرت کی فارسی میں ترجمہ ہوتی تھیں، اسی سلسلہ میں سری ور نے جامی کی تصنیف یوسف زلیخا کا ترجمہ سنسکرت میں کیا، اور

اس کا نام کتھا کوتک رکھا، ملا احمد سنسکرت اور فارسی کے عالم تھے، انھوں نے سلطان کے حکم سے مہا بھارت اور کلہن کی تصنیف راج ترنگنی میں سلطان زین العابدین کے عہد تک کے حالات کا اضافہ کیا، اس کے بعد اس کے شاگرد سری ور نے اس میں مزید اضافہ کیا تھا، اور اس کا نام جین راج ترنگنی رکھا، جون راج اور سری ور دونوں سلطان زین العابدین کے دربار سے وابستہ تھے، سری سلطان کو والمیکی کی برہم درشن اور اس کے ساتھ سمجھا پڑھ کر سناتا، اور ان کی شرحیں بھی کرتا جاتا، اسی طرح پنڈت آکر سلطان کو شاستر بھی سنایا کرتے تھے (تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۴۴۳ و کشمیر سلاطین کے عہد میں از ڈاکٹر محب الحسن باب پنجم) فرشتہ نے اپنی تاریخ میں سلطان کی سیاسی رواداریوں کا ذکر بہت تفصیل سے کیا ہے، جس کو مختصر طریقہ پر اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے، کہ وہ خود علوم و فنون کا ماہر تھا، اس لئے اس کی مجلس مسلمان اور ہندو فضلاء سے معمور رہتی تھی وہ عمارتوں کی تعمیر، زراعت کی ترقی اور نہروں کے جاری کرنے میں مصروف رہتا، اس نے ایک عام حکم جاری کر رکھا تھا کہ اس کے ملک میں جس شخص کا مال چوری ہو جائے اس کا تاوان قریات کے رئیس ادا کریں، اس طرح چوری اس کی سلطنت میں بالکل ختم ہو گئی تھی بھیشو دیو بھٹ کے زمانہ سے جو بری رسمیں ملک میں جاری تھیں ان کو بالکل ختم کر دیا، نرخ کا اندراج جیسا اس کے زمانہ میں ہوا پہلے کبھی نہیں ہوا، اس نے اپنے قواعد و ضوابط تانبے کی تختیوں پر لکھوا کر انھیں ہر شہر اور گاؤں میں نصب کرایا، جس سے ظلم کا خاتمہ ہو گیا، ان تختیوں پر یہ لکھا ہوتا کہ جو شخص ان قوانین پر عمل نہ کرے اس پر خدا کی لعنت ہو، سلطان کے یہاں ایک حاذق طبیب سری بھٹ نامی تھا، وہ اس پر بڑا اعتماد کرتا تھا، اس کے کہنے پر سلطان نے ان برہمنوں کو جو سکندر شاہ

کے عہد حکومت میں سیہ بٹ (شودیو) کے مظالم کی وجہ سے جلاوطن ہو گئے، دور دراز مقامات سے بلا لیا، اور ان کی املاک واپس کر دیں، ہندوؤں کے مندروں میں پوجا کے اوقات مقرر کئے، جزیہ کا حکم منسوخ کر دیا، گاؤکشی ختم کر دی، برہمنوں اور ہندو قاضیوں کو طلب کر کے ان سے عہد لیا کہ وہ کبھی جھوٹ نہ بولیں گے، اور جو کچھ ان کی مذہبی کتابوں میں لکھا ہوا ہے اس کے خلاف کچھ نہ کریں گے، سلطان نے پیشانی پر قشقہ لگانا، ستی ہونا وغیرہ جو سکندر شاہ کے عہد میں ختم ہو گئے تھے، از سر نو جاری کیا، پیش کش، جرمانے اور دوسرے مصادرات کی رقمیں جو شقدار رعایا سے وصول کرتے تھے، بالکل بند کر دیئے، اس نے حکم دیا کہ جو سوداگر جو مال باہر ملکوں سے لائیں، ان کو اپنے گھروں میں چھپا کر نہ رکھیں اور جس قیمت پر خرید کر لائیں، اس پر تھوڑا سا نفع رکھ کر فروخت کریں، اور لین دین میں غبن نہ کریں...... اس کے آئین میں یہ بھی تھا کہ جو علاقہ فتح کیا جاتا اس کا خزانہ لشکریوں میں تقسیم کر دیا جاتا، اور جو خراج وہاں کی رعایا سے لیا جاتا وہی وصول کیا جاتا ہے، سلطان سرکشوں اور ستمگروں کی گوشمالی اچھی طرح کرتا رہتا، اور ان کو اعلیٰ مرتبہ سے ادنیٰ درجہ تک پہنچا دیتا، وہ فقیروں اور ضعیفوں سے مہربانی سے پیش آتا، اور ان کی نگہداشت کرتا تاکہ امیر زیادہ امیر ہو کر باغی نہ ہو جائیں، اور نہ کوئی غریب ہو کر فقیر ہو جائے، سلطان کی پارسائی کا حال یہ تھا کہ وہ نامحرم عورتوں کو اپنی ماں اور بہن تصور کرتا، کسی نامحرم عورت پر بری نظر نہ ڈالتا، اور نہ دوسرے کے مال میں خیانت کرنے کا لالچ دل میں لاتا، وہ رعایا پر مہربان تھا، اس لئے مروجہ گز اور جریب میں اضافہ کیا...... اس کے عہد میں ہر شخص اپنے عقیدہ کے مطابق اپنے مذہبی احکام بجا لاتا، کوئی شخص کسی سے تعصب کی بنا پر تعرض نہیں کر سکتا تھا......

(تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۲۴۳ - ۲۴۲)

اس عہد کے ایک ہندو مورخ شری ور کا بیان ہے کہ سلطان اپنے مذہبی فریضہ کا سختی سے پابند تھا، پانچوں وقت کی نماز پڑھتا، رمضان کے مہینے میں روزے بھی رکھتا، امور حکومت میں شیخ الاسلام کے مشورے سے کام انجام دیتا، وہ صوفیائے کرام اور علماء کی بڑی عزت کرتا، لیکن اسی کے ساتھ برہمنوں اور پنڈتوں کا بھی احترام کرتا، اس نے مندروں کی مرمت اور تعمیر کی اجازت دی، اور کچھ کو اس نے خود مرمت اور تعمیر کرایا اس نے برہمنوں کی ایسی زمین دی، جس کا لگان معاف تھا، مندروں پر زمینیں وقف کیں، وادی کشمیر میں مختلف مقدس مقامات کی یاترا کے لئے آنے والے یاتریوں کو مفت کھانا دیا جاتا تھا، اس کے لئے جو جاگیر وقف تھی، اس کو سلطان نے اور آگے بڑھایا، اور ایک عمارت ان یاتریوں کے قیام کے لئے بنوائی، ہندوؤں کے تہواروں میں شریک ہوتا، شری جین مٹھ کے بھکشو برتنوں کی پوجا کا جشن مناتے، تو اس میں وہ شریک ہوتا، بھکشوؤں کو کھانا کھلاتا، ناگ یاترا کے دن اور گن چکر کے تہوار کے زمانے میں پانچ دن تک پجاریوں کو چاول، گوشت اور پھل وہ خود دیتا، چاند کی تیرہویں کو انہیں لحاف اور دوسری چیزوں کے تحفے دیکر رخصت کرتا، ہندوؤں کو اچھے اچھے عہدے دینے میں فراخدلی سے کام لیتا، شیو بھٹ برہمن اور بودھ مذہب کے پیرو تلک اچاریہ اس کے بڑے معتمد سیاسی مشیر تھے، شری بھٹ اس کی عدالت انصاف کا منصرم تھا، جب اس کا انتقال ہوا، تو سلطان کو بڑا دکھ ہوا، اس نے اس کے لئے بہت بڑی رقم خیرات کی، کرپور بھٹ برہمن اس کا خاص طبیب تھا، (بحوالہ کشمیر سلاطین کے عہد میں از ڈاکٹر محب الحسن اردو ترجمہ شائع کردہ دار المصنفین اعظم گڈھ ص ۱۲۵ - ۱۱۵)

مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی

از

جناب مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی

"علمائے سلف کے حالات کتابوں میں بہت پڑھے ہیں، لیکن ایسے چند ہی بزرگوں کو دیکھنے کا موقع ملا ہے جن کے اندر علم و عمل کا کمال نظر آیا، مولانا حیدر حسن رحمۃ اللہ علیہ انہی صاحب کمال بزرگوں میں تھے، جن کو دیکھ کر علمائے سلف کی یاد تازہ ہوجاتی تھی، یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اُن کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا موقع ملا اور کئی برس تک خلوت و جلوت اور سفر و حضر میں اُن کے ساتھ رہنے کی سعادت نصیب ہوئی، جس قدر اُن کے حالات سے واقفیت ہوئی اسی قدر عقیدت میں اضافہ ہوا، اُن کا علمی تبحر، اُن کا زہد و تقویٰ، ان کا ذوقِ عبادت، ان کا شوقِ خدمت، اُن کا حُسنِ اخلاق، ان کا انکسار، اُن کی بے نفسی، اُن کی مہمان نوازی، اُن کی انسان دوستی، ان کا بزرگوں کا ادب، ان کی دوستوں پر نوازش، اُن کی خوردوں پر شفقت ان کی عالی ظرفی، ان کی بلند ہمتی، ان کی فیاضی، ان کا حسن سلوک، اُن کی بے خوفی، اُن کی حق گوئی، اُن کا استغناء، ان کا توکل، ان کا امیروں سے احتراز، اُن کا غریبوں کا خیال، محتاجوں کی حاجت روائی، تنگ دستوں کی دست گیری، کس کس بات کو یاد کیا جائے، اُن کا خیال کرتا ہوں تو بے ساختہ زبان پر آجاتا ہے؛:-

ع بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

عرصہ سے احباب کا تقاضا تھا کہ مولانا مرحوم کے متعلق اپنی یادداشتوں کو قلمبند کر دوں، ذیل کی سطور اُن کی فرمایش کی تعمیل میں لکھی جا رہی ہیں، امید ہے کہ اہلِ علم کے حلقہ میں دلچسپی سے پڑھی جائیں گی، ممکن ہے مولانا کے واقعاتِ زندگی کسی کو متاثر کریں، اور اُن کے اخلاقِ عالیہ کو معیارِ عمل بنانے کی رغبت ہو، فقط

عبد السلام قدوائی

خاندانی حالات

مولانا حیدر حسن خاں نسلاً افغانی تھے، اور اپنے پٹھان ہونے پر فخر کرتے تھے، اُن کے آباء و اجداد یاغستان میں عرصہ تک مقیم رہے، پھر وہاں سے اُن کے بزرگ نجیب آباد (ضلع بجنور) آئے، یہ ہندوستان میں بڑی اتھل پتھل کا زمانہ تھا، ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی جنگ نے مرہٹوں کا زور توڑ دیا تھا، اور توقع تھی کہ مغلوں کا بجھتا ہوا چراغ پھر روشن ہو جائے گا، احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان سے جاتے وقت دہلی کا تخت شاہ عالم کو سونپ دیا تھا، اور نجیب الدولہ، شجاع الدولہ اور دوسرے سرگروہ امیروں کو اُن کی امداد پر مامور کیا تھا لیکن امراء کی خود غرضی، بادشاہ کی نااہلی اور سرداروں کی باہمی چپقلش نے سارا منصوبہ خاک میں ملا دیا، اور تین ہی سال کے اندر حالت ایسی ہو گئی کہ ۱۷۶۴ء میں مٹھی بھر انگریزوں نے شاہ عالم اور اُن کے ساتھیوں کو شکست دی، اور بنگال سے دہلی تک سارے شمالی ہند کے ٹھیکہ دار بن گئے،

مولانا کے پردادا غالباً ابدالی لشکر کے ساتھ ہندوستان آئے، پھر نجیب الدولہ کے ساتھ نجیب آباد چلے گئے، لیکن جب روہیلوں کا اقتدار ختم ہو گیا، تو نجیب آباد کا قیام مناسب نہیں معلوم ہوا، اتفاق سے اسی زمانہ میں نواب امیر خاں نے ٹونک میں اپنی ریاست

قائم کی، امیر خاں بھی یاغستانی تھے، اور بنیر کے رہنے والے تھے، بنیر مولانا کا بھی آبائی وطن تھا، اس تعلق کی بنا پر مولانا کے دادا غلام حسین خاں نجیب آباد سے ٹونک آ گئے، اور نواب امیر خاں کی سرپرستی میں زندگی بسر کرنے لگے، غلام حسین خاں کے صاحبزادہ احمد حسن تھے، انھوں نے سپاہیانہ زندگی کے مقابلہ میں علمی زندگی کو ترجیح دی، یہی مولانا احمد حسن خاں ہمارے مولانا کے والد تھے،

پیدایش

۱۲۸۱ھ (۱۸۶۴ء) میں مولانا حیدر حسن خاں ٹونک میں پیدا ہوئے، اُن سے پہلے اُن کے دو بھائی مولانا محمد حسن اور مولانا محمود حسن پیدا ہو چکے تھے، دونوں بھائی عمر میں مولانا سے کافی بڑے تھے، مولانا کے بعد دو بھائی مولانا مظہر حسن خاں اور حکیم مسعود حسن خاں اور ہوئے یہ سب بھائی علم و فضل میں ممتاز تھے، مولانا محمد حسن کو فقہ میں بڑا کمال تھا، وہ ریاست ٹونک کے مفتی مقرر ہوئے، مولانا محمود حسن غیر معمولی قابلیت رکھتے تھے، انھوں نے معجم المصنفین کے نام سے بڑی عظیم الشان کتاب لکھی ہے، اس میں اسلام کے ابتدائی دور سے اپنے زمانہ تک کے مسلمان مصنفین کے حالات قلمبند کئے ہیں، اس کی چھ جلدیں دائرۃ المعارف حیدرآباد نے شائع کی ہیں، پوری کتاب چالیس جلدوں میں تمام ہوگی، یہ کتاب کیا ہے مصنفین اسلام کی ایک انسائیکلوپیڈیا ہے، ان کا ایک پُر مغز رسالہ اصول توارث بھی ہے جس میں تعامل کی شرعی حیثیت واضح کی گئی ہے، مجھے ان کی ملاقات کا شرف اور اُن کی باتوں سے مستفید ہونے کا موقع ملا ہے، مولانا مظہر حسن خاں کو زبانوں کی تحقیق سے بڑی دلچسپی تھی، میسور کے کسی کالج میں پروفیسر تھے، انھوں نے ایک بڑی معرکہ کی کتاب لکھی ہے، جس میں عربی کو ام الالسنہ ثابت کیا ہے، مسعود حسن خاں صاحب کو طب سے بڑی مناسبت تھی، اور بڑے حاذق طبیب تھے، وہ دہلی میں باڑہ ہندو راؤ کے قریب رہتے تھے، مولانا

حیدر حسن خاں صاحب جب دہلی تشریف لاتے، تو انہی کے مکان میں قیام کرتے، راقم الحروف کو اُن کی ملاقات کا بھی شرف حاصل ہوا ہے، بڑے خلیق اور مہمان نواز تھے۔

ابتدائی تعلیم و تربیت

مولانا نے ایک دیندار اور صاحب علم گھرانے میں آنکھیں کھولیں، اور اسی فضا میں پروان چڑھے، اس لئے علم کا شوق اور دین کا احترام خمیر میں داخل ہو گیا، بولنے اور سمجھنے کی صلاحیت ہوئی تو تعلیم شروع ہوئی، شروع میں بڑے بھائی مفتی محمد حسن خاں اور منجھلے بھائی مولانا محمود حسن خاں سے پڑھنے لگے، عمر ذرا آگے بڑھی، تو ٹونک ہی کے ایک اور عالم محمد حسن اور مولانا عبدالکریم سے درسی کتابیں پڑھنے لگے، لیکن صحت کی خرابی کی وجہ سے بڑے بھائیوں کی طرح اُن کی رفتار تعلیم زیادہ تیز نہیں تھی، اُن کے والد اپنے لڑکوں کے بارہ میں بڑے اونچے خیالات رکھتے تھے، اور چاہتے تھے کہ جلد از جلد علم کے اعلیٰ مراتب تک پہنچ جائیں، اس لئے وہ اُن کی موجودہ رفتار تعلیم سے مطمئن نہیں تھے، مولانا فرماتے تھے کہ ایک دن میں گھر میں کھانا کھا رہا تھا، اتنے میں والد صاحب آگئے، اور والدہ کو مخاطب کرکے کہنے لگے کہ مجھے حیدر حسن کے رنگ اچھے نظر نہیں آتے، پھر انھوں نے شہر کے بعض جاہل اور ناکارہ لڑکوں کا ذکر کیا، اور کہنے لگے کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ انھیں کی طرح نہ ہو جائے، اور اپنے پڑھے لکھے بھائیوں کے درمیان جہالت کی زندگی گزارے، اس زمانہ میں دستور یہ تھا کہ لڑکے باپ سے رعب اور فرط ادب کی بنا پر گفتگو نہیں کرتے تھے، عموماً ایسے مواقع پر ماں کی وساطت سے بات ہوتی تھی، والد تو اتنا کہہ کر چلے گئے، لیکن مولانا کے لئے ان کے الفاظ تیر و نشتر بن گئے، کہتے تھے کہ کھانا دشوار ہو گیا، فرط غم سے نوالے حلق میں پھنسنے لگے، دل میں تہیہ کر لیا کہ چاہے جو کچھ ہو علمی کمالات حاصل کرکے دم لوں گا،

لاہور کا سفر

اس زمانہ میں ٹونک میں لاہور کے مدرسہ نعمانیہ اور اس کے صدر مدرس

مولانا غلام احمد[1] کی بڑی شہرت تھی، مولانا نے دل میں اُن سے اکتساب فیض کا پکا ارادہ کر لیا، ماں سے زاد راہ اور سفر خرچ کے لئے کچھ روپئے لے کر لاہور روانہ ہو گئے، اور یہ عہد کر لیا، کہ جب تک خاطر خواہ تعلیم مکمل نہ کر لیں گے، گھر واپس نہ آئیں گے، مولانا غلام احمد درس و تدریس کے امام تھے، اُن کی وجہ سے مدرسہ نعمانیہ طالبین علم کا مرکز بن گیا تھا، شائقین علم

---

[1] مولانا غلام احمد اپنے زمانہ کے بڑے نامور استاذ تھے، کوٹ اسحٰق ضلع گجرانوالہ میں ۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے، اور ۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۷ء میں لاہور میں وفات پائی، معقولات اور فقہ و اصول میں نادرۂ روزگار تھے، ریاضی میں بھی اعلیٰ استعداد تھی، مولانا شاہ دین لدھیانوی مولانا عبداللہ ہوشیارپوری اور مولانا غلام قادر بھیروی کے شاگرد تھے، مولانا شاہ دین استاذ العلماء مولانا لطف اللہ کے اور مولانا غلام قادر مفتی صدرالدین خاں دہلوی اور مولانا محمد مظہر نانوتوی کے شاگرد تھے، اس طرح مولانا غلام احمد کی ذات میں اس زمانہ کے تمام مشہور تدریسی سلسلے جمع ہو گئے تھے، تذکرہ نویسوں نے اُن کے کمالات کا بڑے شاندار الفاظ میں اعتراف کیا ہے، صاحب نزہۃ الخواطر نے لکھا ہے کہ میں نے لاہور میں کئی بار اُن سے ملاقات کی ہے، وہ بڑے فاضل اور اعلیٰ درجہ کے فقیہ تھے، بڑے عبادت گزار حلیم الطبع اور منکسر المزاج تھے، خاموشی پسند تھے، مگر اس کے ساتھ اخلاق عالیہ کے مالک تھے، مولانا سید علی زینبی استاذ اعلیٰ مدرسہ فرقانیہ اور نائب مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اُن کی قابلیت کے واقعات سنایا کرتے تھے کہتے تھے کہ ہدایہ فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہے، یہ کتاب مذاہب فقہاء کے بیان، عقلی و نقلی دلائل، اور وجوہ ترجیح کے اعتبار سے بڑی دقیق سمجھی جاتی ہے، اب تو مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے حواشی کی وجہ سے اس کا پڑھانا نسبتۃً آسان ہو گیا ہے لیکن سادہ طور پر عبارت کا مطلب سمجھانے کے علاوہ فنی بصیرت اور علمی مہارت کے ساتھ اس کا درس دینا اب بھی بہت دشوار ہے، مگر مولانا عبدالحی کے حواشی سے پہلے تو ہدایہ کا پڑھانا لوہے کے چنے

دور دور سے کھنچ کھنچ کر وہاں پہونچتے تھے، وہ ایک واسطہ سے مفتی صدر الدین[1] دہلوی

(بقیہ حاشیہ ص ۴۳۷) بچانے سے بھی زیادہ مشکل سمجھا جاتا تھا، لیکن مولانا غلام احمد کو اس کے مشکل مباحث نوک زبان تھے، اور مشکل مقامات کو اس خوبی سے حل کر دیتے تھے کہ لوگ عش عش کرنے لگتے تھے، یہی حال اُن کی قابلیت، ور قادر الکلامی کا منطق، فلسفہ، اور ریاضی کے درس میں تھا، اس علمی قابلیت کے ساتھ سادگی، انکسار، حسن اخلاق، اور شفقت و محبت کا پیکر تھے، بہت ہی سادہ لباس پہنتے، سادہ غذا کھاتے، اور نشست و برخاست میں کسی امتیاز کو گوارا نہیں کرتے تھے، کبھی کبھی لاہور سے گھر جاتے، ایک مرتبہ طبیعت ناساز تھی، سواری کیلئے ٹٹو لے لیا، مولانا حیدر حسن خاں ہمراہ تھے، مولانا غلام احمد کی طبیعت زیادہ اچھی نہ تھی، مگر اُن کی مساوات پسند طبیعت نے یہ گوارا نہ کیا کہ تنہا ٹٹو پر سوار رہیں، تھوڑی دور چلنے کے بعد اتر پڑے اور کہا کہ مولوی جی اب تم سوار ہو جاؤ، مولانا حیدر حسن خاں نے عرض کیا میں آپ کا کمترین شاگرد و ادنیٰ خادم ہوں، میری یہ مجال نہیں کہ آپ پیادہ پا ہوں اور میں سواری پر بیٹھوں لیکن مولانا غلام احمد نے فرمایا نہیں مولوی جی تم کو بیٹھنا ہوگا، مولوی صاحب نے بہتیری منت سماجت کی، مگر مولانا غلام احمد نے اُن کی ایک نہ سُنی، اور جب تک اُن کو سواری پر بٹھا نہ لیا چین نہ آیا، اسی طرح باری باری اُترتے چڑھتے اپنے وطن کوٹ پہونچے، مولانا حیدر حسن خاں نے اس واقعہ کو زندگی بھر یاد رکھا، واقعی تھا بھی یاد رکھنے کے لائق، حضرت عمرؓ کے سفر بیت المقدس کا منظر نگاہ کے سامنے آجاتا ہے،

مولوی صاحب اُن کی سادگی کا ذکر کرتے تھے، کہتے تھے کہ میرا کرتا اُن سے لانبا ہوتا تھا، اور بعض اوقات لوگوں کو دھوکا ہوتا تھا، ایک مرتبہ پیر مہر علی شاہ سے ملنے گئے، انھوں نے مولانا غلام احمد کو اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا، سادہ لباس اور چھوٹے کرتے سے انھیں دھوکا

اور مولانا لطف اللہ[1] علی گڑھی کے شاگرد تھے، حدیث براہ راست میاں نذیر حسین سے پڑھی تھی

مولانا لاہور کے زمانۂ قیام میں آب و ہوا کے فرق کی وجہ سے بیمار پڑے اور چھ مہینے تک بخار

(بقیہ حاشیہ ص ۴۳۸) ہوا، اور استاد سے زیادہ شاگرد کی طرف ملتفت ہوئے مولوی صاحب نے تعارف کرایا تو پیر صاحب کو اندازہ ہوا، اسی سفر کی بات ہے کہ مولوی صاحب نے فرمایا کہ پیر صاحب نے مولانا کو کھانا کھلایا، اور خاطر مدارات کی، مولانا غلام احمد کی خود داری اور عزت نفس کو گوارا نہ ہوا، کہ مفت کا کھانا کھائیں، رخصت ہوتے ہوئے کچھ روپئے پیر صاحب کو نذر کئے، مزاج کی سادگی اور بے تکلفی کا یہ حال تھا، کہ کسی وقت امتیاز کا خیال نہ آتا، عام آدمیوں کی طرح سے چلتے پھرتے، عام آدمیوں کی طرح سے رہتے سہتے، بازار جاتے کسی چیز کی ضرورت محسوس کرتے، تو خریدتے بھی، کبھی جی چاہتا تو راستہ میں کچھ کھا بھی لیتے، کبھی گنا چوستے، مولوی صاحب کہتے بھی کہ آپ ایک ممتاز عالم اور شہر کے معزز فرد ہیں، اس طرح سر راہ لوگ کھاتے دیکھیں گے تو کیا کہیں گے، پُرانے فقہا نے بازار میں کھانے پینے کو معیوب قرار دیا ہے، ایسے شخص کی شہادت معتبر نہیں سمجھتے مولانا غلام احمد مسکرا کر فرماتے، مولوی جی ہمیں کہاں گواہی دینی ہے، ہم ان تکلفات میں اپنے کو تکلیف کیوں پہنچائیں، راستہ میں کہیں مجمع ہوتا، یا کوئی چیز قابل دید ہوتی، تو رک جاتے اور مولوی صاحب سے کہتے کہ دیکھو مولوی صاحب عذر کرتے، مگر فرماتے مولوی جی دیکھ بھی لو، دیہات میں یہ تماشے کہاں دیکھنے کو ملیں گے، طلبہ کے ساتھ ان کی غایت شفقت اور دلداری تھی، ورنہ اُن کے زہد و تقوی، عبادت و ریاضت، اور متانت و سنجیدگی کی شہادت تذکرہ نویسوں کی زبان سے سُن چکے ہو،

[1] (حاشیہ ص ۴۳۸) مفتی صدر الدین خاں آزردہ دہلی کے نامور مفتی، عالم، ادیب اور رئیس تھے، غدر سے پہلے ہی اُن کی شہرت کا آفتاب نصف النہار تک پہنچ چکا تھا، آخر مغل بادشاہ

نے پیچھا نہیں چھوڑا، فرماتے تھے کہ تم لوگ ہوتے تو اس بخار کو دق سمجھتے اور چارپائی پر پڑ جاتے
مگر میں نے اس بیماری کی ذرا بھی پروا نہیں کی اور برابر اپنے کام میں لگا رہا، اور دعا کرتا رہا
کہ گھر سے جو عہد کرکے آیا ہوں، اللہ اسے پورا فرمائے، اور میں کامیاب ہو کر سرخروئی کے ساتھ

(بقیہ حاشیہ ص ۴۳۹) بہادر شاہ اُن کے بڑے قدردان تھے، تدریس و افتاء کے ساتھ شعر و ادب
کا بھی بہت پاکیزہ ذوق رکھتے تھے، آزردہ تخلص تھا، تفسیر و حدیث اور فقہ و اصول وغیرہ
علوم دینیہ میں شاہ محمد اسحاق کے شاگرد تھے، شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر سے بھی
اکتساب فیض کیا تھا، منطق و فلسفہ وغیرہ علوم معقولات میں مولانا فضلِ حق خیرآبادی کے شاگرد
تھے، اپنی دینداری وجاہت اور علمی کمال کی وجہ سے مرجعِ خلائق تھے، اور اُن سے تلمذ کی نسبت
قابلِ فخر سمجھی جاتی تھی، قلعہ کی آمد و رفت اور بہادر شاہ سے تعلق کی وجہ سے غدر میں فتویٰ
بغاوت کا الزام لگا، جائداد ضبط ہوئی، اور چند ماہ قید میں بھی رہے، لیکن پھر تحقیقات کے
بعد بری ہوئے، جائداد واگذار ہوئی اور انگریزی حکومت میں صدر الصدور کا منصب ملا،
۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء میں ۸۱ سال کی عمر میں وفات پائی، "چراغِ دوجہاں بود" سے اُن کی تاریخ نکلتی ہے،

(تذکرہ علمائے ہند رحمٰن علی)

حاشیہ نمبر ۲ متعلق ص ۴۳۹)

ہ مولانا لطف اللہ اپنے زمانہ کے نامور مدرس بلکہ استاذ الاساتذہ تھے، ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۸ء میں پلکھنہ
ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئے، اور نوے سال کی عمر میں ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۵ء میں وفات پائی، ابتدائی تعلیم
وطن میں حاصل کی پھر مفتی عنایت احمد کاکوروی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے، اور تمام
درسی علوم انہی سے حاصل کئے، حدیث کی سند قاری عبدالرحمٰن پانی پتی سے لی، جو شاہ عبدالعزیز
کے نواسے اور جانشین شاہ محمد اسحاق کے شاگرد تھے، اور ساری زندگی تدریس میں گذار دی،

وطن جاؤں،

مولانا پٹھان تھے، اور پٹھانی آن اُن میں ہمیشہ رہی، چاہے جان چلی جائے مگر آن میں
فرق نہ آئے، یہ کبھی اُن کے ذہن سے فراموش نہیں ہوا، کوئی انھیں کمزور سمجھے یہ کبھی گوارا نہ تھا،
بڑھاپے میں بھی اُن کی ہمت کے سامنے جوانوں کے چھکے چھوٹ جاتے، لاہور میں تو نوعمر تھے،
پھر بھلا شدائد کے سامنے کس طرح سپر انگندہ ہوتے، پنجاب کی سردی مشہور ہے، جاڑوں میں
اچھے اچھوں کے دانت بجنے لگتے ہیں لیکن مولانا دسمبر جنوری کی شدید سردی میں بھی ایک سوتی
چادر پر اکتفا کرتے، کہتے تھے کہ مجھے شرم آتی تھی کہ جوان ہو کر سردی مناؤں، اگر روئی

(بقیہ حاشیہ ص ۴۴۰) ابتدا میں کچھ عرصہ کانپور کے مدرسہ فیض عام میں مدرس تھے، پھر
علی گڑھ چلے آئے، اور تا دمِ مرگ وہیں درس دیتے رہے، ان کی شہرت ہندوستان سے باہر
تک پہونچی، اور افغانستان و خراسان تک سے طالبینِ علم استفادہ کے لئے پہونچنے لگے، اُن کے شاگردوں
میں درس و تدریس کا ایسا شوق پیدا ہو جاتا تھا کہ سیکڑوں مدرسے قائم کر دیئے، ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء میں
ریاست حیدرآباد کے وزیر اعظم نواب وقار الامراء نے حیدرآباد بلا کر دار العلوم کی صدارت
تفویض کی، پھر افتاء کی خدمت بھی سپرد کی لیکن آخر میں جب آنکھوں سے معذور ہو گئے تو
پنشن لے کر علی گڑھ واپس آ گئے، اور باقی زندگی وہیں بسر کی، اس علم و فضل اور اثر و رسوخ کے
باوجود طبیعت میں بڑا انکسار تھا، تکلف سے دور اور فقراء و مساکین کے ہمدرد و غمگسار تھے،
غریبوں کے پاس بیٹھ جاتے، اور جہاں تک ہو سکتا اُن کی مدد کرتے، شریعت کے بہت پابند تھے،
علماء سے محبت اور مشائخ کی عزت کرتے، مزاج میں بشاشت تھی، ہر ایک سے حُسنِ اخلاق سے
پیش آتے، کسی کی برائی نہ کرتے، عیب جوئی سے نفرت تھی، مخالفوں کے ساتھ بھی حسن سلوک
کرتے، ندوہ سے بڑا تعلق تھا، ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۴ء میں کانپور میں پہلے اجلاس کی پھر ۱۳۱۳ھ (۱۸۹۶ء)

کی رضائی اون کا کمبل اوڑھوں تو لوگ کیا کہیں گے، کہ جوانی میں اُون اور روئی کا محتاج
ہے۔ یہ شان اُن کی بڑھاپے تک قائم رہی، شدید سردی میں بھی ایک شلوکے سے
زیادہ نہیں پہنتے تھے، اور اُس کے بھی بٹن کھلے رہتے تھے، آخر عمر میں جب سن زیادہ
ہوگیا تھا۔ تو ہم لوگ بٹن بند کرنے لگتے، تو فرماتے، میاں کبھی ایسا نہیں کیا، جب ہم
لوگ اس کے باوجود نہ مانتے اور لگا ہی دیتے تو پھر خاموش ہو جاتے، میں جب کبھی
جاڑوں میں اُن کا مہمان ہوتا، تو کہتے اس کو جاڑا بہت لگتا ہے، اس پر دو لحاف
ڈال دو،

مولانا کچھ عرصہ سرحدی علاقہ میں بھی رہے تھے، جہاں جاڑوں میں پانی جم جاتا ہے،
کہتے تھے کہ بارہا ایسا ہوا کہ پچھلے پہر تہجد کے وقت ندی میں برف توڑ توڑ کر غسل کرنا پڑا،
شاید اس وجہ سے وہ سردی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، کسی کو بہت اوڑھے پہنے دیکھتے
تو بہت تعجب کرتے تھے، نواب علی حسن خان ناظم ندوۃ العلماء کے یہاں آمد و رفت رہتی
تھی، اُن کے والد نواب صدیق حسن خاں بھی شیخ حسین کے شاگرد تھے، بھوپال کے قیام

بقیہ حاشیہ ص ۴۴۱) میں بریلی میں ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسہ کی صدارت کی، ندوہ کی تاسیس
زیادہ تر ان کے شاگردوں اور مولانا فضل الرحمن گنج مرادآبادی کے مریدوں کی رہین منت ہے،
ندوہ کے ناظم اول مولانا محمد علی مونگیری اُن کے شاگرد خاص تھے، حکیم سید عبدالحئی صاحب مولانا
احمد حسن کانپوری، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، اور مولانا ظہور الاسلام فتحپوری سب اُسی
درس گاہ کے فیض یافتہ تھے، مولانا فضل الرحمن گنج مرادآبادی کے دل میں اُن کی بڑی وقعت تھی
آنے جانے والوں سے حال پوچھتے رہتے، اور خدمت کی تاکید کرتے۔

(ماخوذ از نزہۃ الخواطر و استاذ العلماء)

کے زمانہ میں نواب صاحب سے ملاقات ہوتی تھی، نواب صاحب کے علمی انہماک اور
دینداری کے واقعات سنایا کرتے تھے، اگرچہ نواب صاحب اہل حدیث تھے، اور مولانا
شدید حنفی، مگر بایں ہمہ نواب صاحب کی قدر کرتے تھے، اور ان کی علمی و دینی خدمات
کا اعتراف کرتے تھے، کہتے تھے کہ نواب صاحب روزانہ ایک جزو تصنیف کر لیتے تھے،
کبھی کسی کے یہاں کسی تقریب یا دعوت میں جاتے اور کھانے میں دیر ہوتی تو وہیں تصنیفی کام
شروع کر دیتے، علماء اور طلباء کی بہت زیادہ عزت کرتے تھے، اور ان کی خدمت باعث
سعادت سمجھتے تھے، کہتے تھے کہ ہر جمعرات کو ان کے یہاں علماء اور طلبہ کی دعوت ہوتی تھی اس
موقع پر نواب صاحب بنفس نفیس خود سب کے ہاتھ دھلاتے، اور یہ پانی برکت کے لیے گھر کے کونوں
میں ڈلواتے، نواب صاحب سے محبت اور تعلق خاطر کی بنا پر مولانا ان کی اولاد اور اہل خاندان
سے ربط ضبط رکھتے تھے، چنانچہ جب مولانا لکھنؤ آئے، تو نواب علی حسن خان اور ان کے
دوسرے اعزہ سے ملنے بھوپال ہاؤس جایا کرتے تھے، اس مجلس میں نواب علی حسن خان
صاحب کے برادر نسبتی نواب رشید الدین عرف اچھے صاحب بھی ہوتے تھے، وہ جاڑوں میں
سردی سے حفاظت کا بڑا اہتمام کرتے تھے، مولانا کہتے تھے کہ ایک رات گیا تو وہ اتنا اوڑھے
پہنے تھے کہ میں نے کہا ساری سردی یہیں پھٹ پڑی ہے، اس وقت میں حسب عادت
صرف شلوکا پہنے ہوئے تھا، اچھے صاحب بار بار مجھے تعجب سے دیکھتے تھے، اور کہتے صرف
ایک شلوکا پہنے ہیں، آپ کو جاڑا نہیں لگتا، ابھی تو آپ کو ندوہ تک جانا ہے، کھلے میدان
میں کیا ہوگا، سردی غضب کی ہے، اُن کے سوالات اور تعجب انگیز نظروں کو دیکھ کر
میں نے اپنے جی میں کہا آج یہ نظر لگا کر رہے گا، مولانا نظر کے اثر اور مکان کی نحوست کے
بڑے قائل تھے، اس سلسلہ میں وہ حدیثوں سے استدلال کرتے تھے، محدثین نے ان کے دوسر

معانی بیان کئے ہیں، اسی طرح سواری اور عورت کے بارہ میں بھی شرارت اور بدمزاجی وغیرہ معانی بتائے ہیں، لیکن مولانا کو اتفاق سے کچھ ایسے تجربے ہوئے تھے، کہ وہ ان توجیہات کے بجائے نحوست ہی مراد لیتے تھے،

مولانا غلام احمد کے یہاں کئی برس قیام کیا، اور جب سارے مروجہ علوم حاصل کرلئے تو سند فراغ حاصل کی، واپسی میں استاذ الاساتذہ مولانا لطف اللہ کے حلقۂ درس میں بھی کچھ عرصہ شریک رہے، اُن کے وفورِ علم، قوتِ بیان، حسنِ کلام، اور انہماک و ولولہ کا برابر ذکر کرتے رہتے تھے، حدیث شریف کی متداول کتابیں اگرچہ لاہور میں پڑھ لی تھیں، لیکن کسی صاحبِ نظر محدث کے درس میں بیٹھنے کی فکر تھی، اس زمانہ میں دہلی میں میاں سید نذیر حسن[1] کے درسِ حدیث کی بڑی شہرت تھی، مولانا وہاں پہونچے اور کچھ عرصہ تک اُن کے حلقۂ درس میں شریک رہے لیکن مولانا فقہ حنفی سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے، اور میاں صاحب پر اس

---

[1] میاں سید نذیر حسین ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) میں سورج گڑھ بہار میں پیدا ہوئے اور ۱۳۲۰ھ میں دہلی میں وفات پائی، ۱۲۳۶ھ میں حضرت سید احمد شہید مولانا اسماعیل شہید اور مولانا عبدالحئی شہید کی زیارت کا شرف حاصل ہوا تھا، یہ اُن کی بالکل نوعمری کا زمانہ تھا، مگر طبیعت نے اس کا غیر معمولی اثر لیا اور اسی کا نتیجہ توحید کا غلبہ اور اتباعِ سنت کا وہ جوش تھا، جو انھیں ساری زندگی رہا، ابتدائی درسی کتابیں الہ آباد میں پڑھیں پھر دہلی گئے اور سید عبدالخالق دہلوی، شیر محمد قندھاری جلال الدین ہروی، شیخ عبدالقادر رامپوری وغیرہ فاضل اساتذہ سے درسیات کی تکمیل کی، پھر شاہ محمد اسحاق صاحب کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے، اور حدیث شریف کی مکمل تعلیم ان سے حاصل کی، پہلے فقہ حنفی سے بڑا لگاؤ تھا، اور کئی برس تک فقہ و اصول کی تعلیم سے شغف رہا، لیکن بعد کو قرآن و حدیث کا غلبہ ہوا، اور ساری زندگی اس میں گذار دی، تقلید کے بجائے تحقیق کا

زمانہ میں عدمِ تقلید کا غلبہ تھا، اس لئے مولانا کا وہاں جی نہ لگا، ایک دن میاں صاحب سے کہنے لگے آپ کی تقریر سے تو برابر یہ ثابت ہوتا رہتا ہے کہ احناف کے دلائل کمزور اور ان کی مستند حدیثیں ضعیف ہیں، یہ بات سمجھ میں نہیں آتی، کیا حنفی ضعیف روایتوں ہی پر عمل کرتے ہیں؟ یہ کیونکر ممکن ہے، مولوی صاحب ابھی طالب علم تھے، حدیث و رجال پر اُن کی زیادہ نظر نہیں تھی، میاں صاحب کے سامنے دلائل کیا پیش کرتے، اپنے مسلک کی محبت میں جذباتی انداز میں یہ بات کہی، میاں صاحب کو یہ انداز پسند نہیں آیا، اور فرمایا پٹھان بڑے جاہل ہوتے ہیں، اب حنفیت کے ساتھ پٹھانیت بھی زد میں آگئی بولے میں تو عالم پٹھان ہوں، اس گفتگو کے بعد طبیعت اور اچاٹ ہوگئی،

اس زمانہ میں دہلی کے علاوہ بھوپال بھی حدیث شریف کا بڑا مرکز تھا، وہاں شیخ حسین[1] بن محسن انصاری یمانی درس دیتے تھے، ان کی حدیث دانی کی سارے ملک میں شہرت تھی، اور گوشہ

(بقیہ حاشیہ ص ۴۴۴) شوق غالب تھا، اس سلسلہ میں کئی بار مبتلائے مصائب بھی ہوئے، مگر اپنی روش پر جمے رہے، مولانا امیر علی ملیح آبادی، مولانا شمس الحق ڈیانوی نواب صدیق حسن خاں اور مولانا عبداللہ غزنوی وغیرہ اُن کے خاص شاگرد ہیں، شاہ سلیمان پھلواروی نے بھی اُن سے حدیث پڑھی تھی، اور سند حاصل کی تھی، اسی کا اثر تھا، کہ شروع میں عرصہ تک وہ تقلید نہیں کرتے تھے، (نزہۃ الخواطر جلد ۸)

[1] شیخ حسین بن محسن انصاری یمن کے رہنے والے تھے، شیخ صفی الدین احمد بن قاضی محمد بن علی الشوکانی کے شاگرد تھے، ۱۲۴۵ھ (۱۸۲۹ء) میں حدیدہ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۲۶ھ (۱۹۰۹ء) میں بھوپال میں وفات پائی، یمن ہی میں صرف و نحو اور فقہ و اصول کی تعلیم پائی، پھر علامہ شیخ حسن بن عبدالباری الاہدل سے حدیث کی کتابیں پڑھیں، مفتی زبید سلیمان بن محمد بن عبدالرحمن الاہدل سے بھی حدیث کی تعلیم حاصل کی، پھر حسن اتفاق سے علامہ شوکانی صاحب نیل الاوطار کے صاحبزادہ شیخ

گوشہ سے طالبین حدیث اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، انکی حدیث دانی کی سارے ملک میں شہرت تھی، شیخ صاحب بھی حنفی نہ تھے، وہ امام شافعی کے پیرو تھے، مگر مزاج میں بہت اعتدال تھا، انداز بحث عالمانہ ہوتا تھا، مختلف ائمہ کے مذاہب بیان کرتے تھے، ہر ایک کے دلائل بھی دیتے تھے، لیکن طرز گفتگو ایسا ہوتا تھا کہ کسی کو ناگوار نہیں ہوتا تھا، اور حنفی شافعی مالکی حنبلی، اہل حدیث وغیرہ سب ان کے حلقۂ درس میں شریک ہوتے، تحقیق و تدقیق اور اخذ و ترک میں مختار ہوتے، ہر طرح کی کتابیں موجود ہوتیں، اور طلبہ براہ راست ماخذ سے استفادہ کر سکتے تھے، مولانا حیدر حسن خاں صاحب کو شیخ صاحب کا یہ انداز تدریس بہت پسند آیا، اور اُن کے ایسے گرویدہ ہوئے، کہ پھر کہیں اور کا رخ نہیں کیا، اور شیخ کا دامن مستقل طور پر تھام لیا، اگرچہ حنفیت پر مستقل طور پر جمے رہے مگر

(بقیہ حاشیہ ص ۴۴۵) صفی الدین احمد صنعاء سے حدیدہ آگئے، شیخ حسین نے اس نادر موقع سے فائدہ اُٹھایا اور حدیث کی تمام کتابیں اُن کے سامنے پڑھ کر سند حاصل کی، شیخ شوکانی بڑے محقق اور صاحب نظر تھے، ان کا سلسلۂ حدیث بھی بہت عالی ہے اور بہت کم واسطوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچ جاتا ہے، صرف ۔ [illegible] آدمی درمیان میں پڑتے ہیں، مکہ معظمہ کے محدث حافظ محمد بن ناصر حازمی سے بھی حدیث کی اجازت لی، تعلیم کے بعد کئی برس تک حدیدہ کے قریب لحیہ نامی قصبہ میں قاضی بھی رہے، لیکن پھر بعض مسائل میں ترکی افسر احمد پاشا سے موتیوں کے ٹیکس کے سلسلہ میں اختلاف ہو گیا، احمد پاشا کو اتنا تاؤ آیا کہ شیخ کو توپ سے اڑا دینے کی دھمکی دی، نیم بدن دھوپ میں بے آب و دانہ بٹھائے رکھا، ان حالات سے مجبور ہو کر وطن چھوڑنا پڑا سکندر بیگم کے زمانہ میں بھوپال تشریف لائے یہاں اہل علم نے ہاتھوں ہاتھ لیا دو سال کے بعد وطن کی کشش غالب ہوئی، وہاں کے حالات بھی موافق ہو گئے تھے، اس لیے واپس گئے پھر پانچ سال بعد شاہجہاں بیگم کے زمانہ میں دوبارہ بھوپال آئے اس دفعہ چھ سال قیام رہا پھر وطن چلے گئے اور پانچ سال بعد شاہجہاں بیگم ہی

ہمیشہ دلائل پر نظر رہی اور تاویل و توجیہ کے بجائے محدثین کے طرز پر حدیث و اسماء الرجال کی کتابوں سے کام لیتے تھے، اور اسی انداز میں روایات پر بحث اور جرح و تعدیل کرتے تھے، وہ شیخ صاحب کا والہانہ ذکر کیا کرتے تھے، کہتے تھے، ان کو بخاری کی شروح ازبر تھیں، علامہ ابن حجر عسقلانی کی فتح الباری تو ہر وقت زبان پر رہتی تھی۔

(بقیہ حاشیہ ص ۴۴۶) کے عہد حکومت میں پھر بھوپال واپس آئے، یہ نواب صدیق حسن خاں کا زمانہ تھا، ان کی علم دوستی اور قدر دانی کی وجہ سے پھر کہیں نہیں گئے۔ اور مستقل طور پر بھوپال ہی میں قیام کر لیا، اُن سے ہندوستان میں علم حدیث کو بہت فروغ ہوا، اور بکثرت لوگوں نے فیض حاصل کیا، اُن کے تلامذہ میں نواب صدیق حسن خان، مولانا محمد بشیر سہسوانی مولانا عبد اللہ غازی پوری، شیخ محمد طیب مکی، مولانا وحید الزمان حیدر آبادی مولانا محمود حسن ٹونکی، مولانا حیدر حسن خان اور مولانا حکیم سید عبد الحئی سابق ناظم ندوۃ العلماء خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی بھی شیخ کی بڑی قدر کرتے تھے، شیخ بھی اُن کو سلام کہلا بھیجتے اور دعا کی درخواست کرتے، مرادآباد مولانا کی خدمت میں جانا بھی ہوا، مولانا نے ان سے ملاقات کا بڑا اہتمام کیا، اور بڑی عزت و تکریم کی، مولانا شاہ اسحٰق کے شاگرد تھے، اور حدیث شریف سے خاص تعلق خاطر رکھتے تھے، اور آخر وقت تک درس دیتے رہے، شیخ سے محبت اور ان کی عزت و تکریم ذات نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے عشق اور حدیث شریف سے غیر معمولی لگاؤ کی بنا پر تھی، شیخ حسین کی وفات بھی بالکل عجیب طرح ہوئی، بالکل اچھے تھے، انتقال سے تقریباً دس گھنٹے پہلے احباب کی ملاقات کیلئے گئے، حسب معمول باتیں کیں اور چلتے

شیخ حسین کے یہاں جی لگا کر حدیث پڑھی، شیخ بھی اُن کی محنت و سعی ذوق و شوق، فہم و فراست تلاش و تحقیق مطالعہ و مذاکرہ فکر و نظر سلامت طبع، پرہیزگاری، و نیک عملی اور اطاعت و فرمانبرداری سے بہت خوش رہتے تھے، فراغت کے بعد انھیں درس حدیث کی اجازت دی، اور خود اپنے ہاتھ سے سند لکھ کر دی، اور فلاح دارین کی دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا، علوم متداولہ اور فنون مروجہ کی تحصیل وہ لاہور میں پہلے ہی کر چکے تھے، حدیث کی تکمیل کے بعد انھیں یک گونہ اطمینان ہوا اور ٹونک واپس آئے۔

ملازمت | ٹونک اُس زمانہ میں علم کا مرکز تھا، شاہی خاندان اپنی دینداری اور اہل علم کی قدردانی میں مشہور تھا، نواب وزیرالدولہ حضرت سید احمد شہید کے مرید تھے، اور بالاکوٹ میں سید صاحب کی شہادت کے بعد اُن کے اہل خاندان اور مریدین و متوسلین کو ٹونک میں آباد کیا، اور مصارف کے لئے جاگیریں دیں، قافلہ مجاہدین کی مناسبت سے اس محلہ کا نام ہی قافلہ پڑ گیا، نواب وزیرالدولہ کی سید صاحب سے عقیدت کا یہ حال تھا، کہ اُن کے اعزہ و اقربا کو اپنے اہل خاندان پر ترجیح دیتے تھے، مولوی صاحب بیان کرتے تھے، کہ ایک مرتبہ نواب صاحب کو معلوم ہوا کہ سید صاحب کے داماد دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں، تو انھیں بلا کر کہا کہ دوسری بیوی آئیگی تو صاحبزادی کو تکلیف ہوگی، لیکن اگر آپ شادی سے باز نہیں رہ سکتے، تو کسی اور عورت کے بجائے میری لڑکی سے عقد کر لیجئے، وہ صاحبزادی کی سوکن نہیں بلکہ خادمہ بنکر رہیگی،

(باقی)

(بقیہ حاشیہ ص ۴۴۷) وقت خاتمہ بالخیر کے لئے دعا کی درخواست کی، پھر بیٹے لڑکوں کے گھروں میں گئے عصر کے بعد صاحبزادہ عبد اللہ کے گھر گئے، کسی نے یہ استفسار کیا تھا، کہ کیا حضرت خدیجہ کے جاہلیت کے زمانہ میں لڑکا ہوا تھا، اور اس کا نام عبد العزیٰ رکھا گیا تھا، اس سلسلہ میں ضروری کتابیں منگوائیں، پھر اس سوال کا جواب لکھایا، اتنے میں مغرب کا وقت آگیا، صاحبزادہ وضو کرنے گئے، اور وہ شیخ تکیہ پر ٹیک لگا کر لیٹ گئے، صاحبزادہ واپس آئے، تو محسوس ہوا کہ شاید آنکھ لگ گئی ہو، لیکن دفعۃً سر ایک طرف ڈھلک گیا سنبھالنا چاہا، تو معلوم ہوا کہ روح پرواز کر گئی ہے۔ (ماخوذ از نزہتہ الخواطر جلد ۸) (باقی)

قرآن حکیم اور ذوق کی تربیت

از

جناب مولوی بدر الدین صاحب ایم اے شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ذوق کے معنی | المحیط میں ذوق کے معنی چکھنا، کسی چیز کے مزے سے باخبر ہونا اور بار بار لطف اندوز ہونا ہیں، ابن خلدون نے اس لفظ کے معنی اپنے مقدمہ میں "زبان میں ملکۂ بلاغت کا حاصل کرنا" لکھے ہیں، لسان العرب نے بڑی تفصیل سے ذوق کے معانی و مفہوم کی بحث کی ہے، خلاصہ یہ ہے کہ ذوق کے معنی چکھنا، مزہ حاصل کرنا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ

ذقت فلانا و ذقت عندہ ای خبرتہ،	میں نے اس کو پرکھ لیا، چکھ کر دیکھ لیا، اس کے پاس جو کچھ تھا، اُسے بھی جانچ لیا،

اسی ذیل میں لسان العرب نے حدیث میں ذوق کے معنی کے لئے یہ روایت بیان کی ہے

ان اللہ لا یحبُّ الذواقین والذواقات،	یعنی اللہ تعالیٰ ایسے مردوں اور عورتوں کو پسند نہیں کرتا جو نکاح اور طلاق میں عجلت اور زیادتی کو پسند کرتے ہوں،

یہاں بھی مفہوم وہی ہے کہ ایک کا مزہ چکھا، چھوڑ دیا، دوسرے کو جانچا، علیحدہ کر دیا،

اور بار بار مزہ تبدیل کرتے رہے،

عرب کے محاورہ میں بھی ذوق کے معنی جانچنا اور پرکھنا ہی مراد لئے جاتے ہیں، جیسے کہا جاتا ہے استذقتُ فلاناً، (میں نے فلاں کو چکھنا پرکھنا چاہا)

قرآن کریم میں ذوق کے لفظ سے عذاب چکھانے کے معنی بھی مراد لیے گئے ہیں "مثلاً"

فاذاقھا اللہ لباس الجوع والخوف، — پس اللہ تعالیٰ نے اس کو بھوک اور خوف کے عذاب کا مزہ چکھایا،

لایذوقون فیھا الموت الا الموتۃ الاولیٰ، — جنتی لوگ جنت میں موت کا مزہ بھی نہیں چکھیں گے، سوائے اس موت کے جو پہلے طاری ہو چکی ہوگی؛

ان تمام مطالب کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ ذوق سے مراد سب سے پہلے کسی چیز کو چھونا تاکہ ان کا مزہ حاصل ہو اس کے بعد ذوق کے ثمرہ کی طرف رہنمائی حاصل کرنا، یعنی فیصلہ کرنا کہ شیریں ہے یا تلخ ہے، پھر اس چیز سے نفرت یا محبت کا فیصلہ کرنا۔ لہٰذا تین درجے ہوئے، مقدمہ، فیصلہ اور اس پر عمل۔ اسی طرح جب ذوق کو عام اشیاء میں استعمال کیا جاتا ہے، تو وہاں بھی اس کے معنی یہی مراد لئے جاتے ہیں یعنی ذوق کے ذریعہ کسی چیز کے حسن و قبح، اور اس کے اچھے برے خواص کو معلوم کرنا،

اس کے علاوہ جب کلمۂ ذوق دائرۂ فنون میں داخل ہوتا ہے۔ تو وہاں بھی اُس کا مطلب یہی لیا جاتا ہے یعنی ذوق کے ذریعہ فنی آثار کے حُسن و قبح کو پرکھنا، دوسرے الفاظ میں ہم اس کو یوں کہہ سکتے ہیں، کہ ذوق وہ قوت یا فطری استعداد ہے' جس سے کسی شے کے حسن و قبح کا اندازہ کر کے اس سے فائدہ اٹھایا جا سکے، اور

حسب استطاعت اسے اپنے اقوال و اعمال میں منتقل کیا جا سکے،

یہی ذوق جب ادب کی دنیا میں قدم رکھتا ہے، تو اُس کے اصطلاحی معنی لغوی معنی سے میل کھاتے ہوئے مراد لئے جاتے ہیں یعنی ادب شناسی کا خاص ملکہ پیدا کرنا، اور اس سے ہمکنار ہوتے ہوئے جب ہم ادب نگاروں کی دنیا کی سیر کرتے ہیں، تو وہاں ہمیں تقریر و تحریر کا سارا کھیل ذوق اور جذبہ ہی کا مرہون منت نظر آتا ہے،

بغیر ذوق کے علمی دنیا میں ایک انچ بڑھنا بھی ممکن نہیں، اور ذوق ہو تو پھر میدان عمل کے تیار ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں،

ذوق کی روانی کے لئے تو باقاعدہ تعلیم بھی درکار نہیں، اور حد تو یہ ہے کہ ذوق کی فراوانی میں آنکھوں کی بھی چنداں ضرورت نہیں، ورنہ کیا چیز ہے کہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین مرحوم کی نابینا آنکھوں نے اپنی تحریروں سے دنیا کی نگاہوں کو خیرہ اور حیرت زدہ کر دیا۔ ابن القریہ نے امی ہونے کے باوجود اموی دور میں اپنی فصاحت کا لوہا منوالیا، ع

جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

ذوق کی اسی لاثانی قوت کو احمد الشائب اصول النقد الادبی میں ان الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں:۔

والذوق ینفع فی انشاء الادب — اور ذوق انشاءِ ادب میں نفع دیتا ہے،

ایضاً فان ما ینشئہ الکاتب — نیز ہر کاتب اور شاعر جو کسی کلام کو

او الشاعر ثمرۃ ذوقہ الادبی — وجود میں لاتا ہے، وہ اس کے ادبی

وصورۃ الدقیقۃ، کذالک — ذوق اور نکتہ سنجی کا ثمرہ ہوتا ہے'

اختیار النصوص الادبیۃ — اسی طرح اعلیٰ درجہ کا مستند کلام

متأثر بالذوق خاضع له، و
ذوق الجميل يختار الادب
الجميل،

جس کی گہرائی سے واقفیت حاصل
کی جائے، یہ ذوق ہی کا مرہونِ
منت ہوتا ہے، پھر یہ کہ ذوقِ جمیل
ہی ادبِ جمیل کو اختیار اور پسندیدگی
کی نگاہ سے دیکھتا ہے"

مگر غور طلب بات یہ ہے کہ وہ ذوق جس کے ذریعہ انسان ایک اعلیٰ ادبی شہ پارے کو وجود میں لانے کی صلاحیت پاتا ہے جو انسانی نفوس میں خون کے ساتھ رگوں میں دوڑتا ہے، قلوب کو گرماتا ہے، مزاج کو آمادہ کرتا ہے، طبیعت میں عمل کی چنگاری فروزاں کرتا ہے، آخر وہ خود کیسے اتنی عظیم صلاحیت کا مالک بن جاتا ہے، بغیر کسی عامل کے اس صلاحیت کا وجود میں آجانا ناقابلِ فہم ہے،

دوسرا سوال یہ کہ خود ذوق کی تخلیق کا مبدا، اور منبع کیا ہے۔

اس سلسلہ میں احمد الشائب کہتے ہیں، ذوق کوئی سادہ یا بسیط ملکہ نہیں ہے جیسا کہ عام خیال ہے بلکہ یہ مجموعہ ہے عاطفہ، عقل اور احساس کا، اور بسا اوقات عاطفہ ان میں اہم عنصر ہوتا ہے،

اور جہاں تک ذوق پر اثر انداز ہونے والے عوامل کا تعلق ہے، تو اس کے بارے میں وہ کہتے ہیں، ذوق کوئی منجمد یا بسیط شے نہیں، بلکہ اس پر حالات کا پورا اثر پڑتا ہے اور ذوق کی تخلیق اُس کے نشو و نما اور تبدیلی پر جو عناصر اثر انداز ہوتے ہیں، اُن میں ادیب کے گرد و پیش کا ماحول، زمانہ، نسلی خصوصیات، خاندانی تعلیم و تربیت اور انفرادی مزاج کو بڑا دخل ہے، مگر ذوق کا اصل منبع کیا ہے، یہ کس طرح وجود پذیر ہوتا ہے، اس کو

اجمالاً تین لفظوں میں واضح کیا گیا ہے، کہ یہ عاطفہ، عقل اور احساس کے مجموعی عمل کا نتیجہ ہے،

اس کا خلاصہ یہ نکلا کہ عاطفہ، عقل اور احساس جس ماخذ سے اپنا عملی مواد حاصل کرتے ہیں وہی ذوق کا بھی اصلی سرچشمہ ہوا، وہی منبع اور ماخذ قرار پایا، اب اس اصلی سرچشمہ کی طرف رہنمائی کچھ مشکل نہیں، کیونکہ اس کی وضاحت ہمیں نصیر احمد ناصر کی کتاب "جمالیات قرآن حکیم کی روشنی میں" کے مقدمہ سے ملتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ "قلب انسان کی ایسی موضوعی قوتوں کا سرچشمہ ہے جو اپنی نوعیت میں فعلی اور انفعالی ہیں، فعلی قوتوں کے ماخذ کا نام دماغ ہے اور انفعالی قوتوں کے مبدا، کو دل کے نام سے تعبیر کرتے ہیں، دماغ بہت سی قوتوں کا سرچشمہ ہے، جن میں سے تصور، تخیل، تعقل، تفکر اور تذکر جمالیات کی رو سے بہت اہم ہے، اسی طرح دل بھی متعدد انفعالی قوتوں کا منبع ہے، جن میں سے وجدان اور حسن جمال کی قوتیں اہم امتیازی حیثیت رکھتی ہیں، یہ دونوں قوتیں ہمارے احساسات و انفعالات، تاثرات و جذبات اور عواطف و امیال کے سرچشمے ہیں"

انسانی اعضاء میں دل و دماغ کے ان وظائف اور اعمال کی وضاحت کے بعد اب اس کا سمجھنا ہمارے لئے بہت آسان ہو جاتا ہے، اگر کسی بھی ادیب، شاعر اور نثر نگار کے ذہن کی تخلیق اُس کے ذوق کی مرہونِ منت ہوتی ہے، اور ذوق قلب و دماغ، عقل و حواس کے ذریعہ وجود میں آتا ہے، انہی کے سہارے ذوق کا شاہکار ادبی فن پارے کی شکل میں اپنے مفہوم و معانی سے ضیا پاشی کے قابل بنتا ہے، مگر اس رہنمائی کے حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک گتھی اور ہمارے سامنے آتی ہے، کہ قلب سے کیا مراد ہے، قلب کب اس قابل ہوتا ہے، کہ ذوقِ سلیم کی تعمیر کر سکے، کیا قلب بھی مختلف کیفیات کا اثر قبول کرتا ہے، کیا ذوقِ سلیم اور ذوقِ ردی کی طرح قلب بھی سلیم اور ردی صفات

کا حامل ہو سکتا ہے، ان سوالات کو حل کرنے کے لئے ہمیں قرآن کریم کی طرف رجوع کرنا پڑے گا،

قلب اور دماغ

قرآن حکیم میں مختلف آیات میں قلب کی اصطلاح کو جس معنی میں استعمال کیا ہے، اس سے پوری طرح یہ واضح ہوتا ہے کہ قلب وجود انسانی کی تمام مشاہداتی قوتوں کا مبداء ہے۔ وظائف کے اعتبار سے قلب کے دو حصے کئے جا سکتے ہیں،

ایک دماغ جس کا خاصہ تعقل اور شعور و احساس ہے، دوسرا قلب جو مشاہدات و حوادثِ زندگی سے اثر آفرینی اور اثر پذیری کے لئے وقف ہے، چنانچہ دل دماغ کی ان قوتوں کی وحدت یا کلی مجموعے کو اصطلاحِ قرآنی میں فواد یا قلب کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔

مثلاً :- واللہ اخرجکم من — اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں ماؤں کے
بطون امہاتکم لا تعلمون — پیٹوں سے پیدا کیا، اور تم کچھ بھی
شیئاً وجعل لکم السمع — نہیں جانتے تھے، اور تمہارے سننے
والابصار والافئدۃ لعلکم — اور دیکھنے کی قوتیں) نیز (شعور کی
تشکرون، — قوت) قلب کو بنا دیا تاکہ تم شکر
گذار بن جاؤ،

قلب کو ہم مشاہداتی قوتوں کا مبداء اس لئے کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ بسا اوقات بغیر قلب کی اعانت کے قوتِ باصرہ اور سامعہ اپنا وظیفۂ عمل مکمل نہیں کر سکتی، مشاہدہ شاہد ہے کہ آدمی کسی بات غور سے دیکھتا ہے مگر اتفاق سے اس کا قلب کہیں اور دھیان جائے ہوتا ہے، تو باوجود غور سے دیکھنے کے اسے کچھ بھی یاد نہیں رہتا، کہ کیا دیکھا، یہی حال

سماعت کا ہے،

بہت سے لوگوں کی آنکھیں سوتے میں کھلی رہتی ہیں، مگر وہ کچھ نہیں دیکھتے، کان بدستور ہر حال میں کھلے رہتے ہیں، مگر جب تک حضورِ قلبی نہ ہو آدمی اُن سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا، اس کی صرف ایک وجہ ہے کہ قلب کے اشتراکِ عمل کے بغیر کوئی قوتِ حاسہ صحیح طور پر کام نہیں کر سکتی، مگر اس کے برعکس یہی حال قلب کا ہے، یہ بھی بغیر باصرہ کی مدد کے نہیں دیکھ سکتا، نہ سامعہ کی مدد کے بغیر سُن سکتا ہے،

اس اشتراکِ عمل کو قرآن حکیم نے اپنے مخصوص بلیغ انداز میں اس طرح بیان کیا ہے،

افلم یسیروا فی الارض فتکون — کیا وہ زمین میں سیر و سیاحت نہیں
لہم قلوب یعقلون بہا او — کرتے کہ اُن کے دل و دماغ اُن
اذان یسمعون بہا فانہا — کے واسطے ایسے ہو جاتے کہ وہ اُن سے
لا تعمی الابصار ولکن تعمی — سمجھتے یا کان ایسے ہو جاتے کہ وہ ان
القلوب التی فی الصدور — سے سنتے، یہ نہیں ہے کہ ان کی آنکھیں
(۲۲-۴۶) — اندھی ہو جاتی ہیں بلکہ اُن کے سینے
میں جو قلوب ہیں، وہ اندھے ہو جاتے ہیں،

اس آیت میں ایک تو باصرہ اور قلب کے وظائف پر روشنی ڈالی گئی ہے، دوسرے اُن دونوں کے باہمی عمل کا تعلق معلوم ہوتا ہے، تیسرے یہ کہ باصرہ کے مشاہدہ پر قلب کے عمل کو تفوّق اور فوقیت حاصل ہے،

اگر قلب کا عمل نہ ہو تو قوتِ باصرہ اپنے فرض کی انجام دہی سے قاصر ہے، اس کے علاوہ جو اہم بات اس آیت میں سامنے آتی ہے، وہ یہ کہ کون سے قلب کا عمل اہم ہے؟ معلوم ہوا

کہ صرف اس قلب کے مدرکات اور محسوسات سچے ہوں گے، جو اندھے پن کی بیماری سے پاک ہوگا، اگر قلب صحت مند نہیں ہے، تو وہ قوتِ باصرہ کو مشاہدہ پر یقین کی مہر نہیں لگا سکتا،

اس سے معلوم ہوا کہ قلب بھی اپنے عوارض کے لحاظ سے مختلف کیفیات کا حامل ہو سکتا ہے، اور اس پر بھی سلیم اور ردی حالتیں گذرتی ہیں،

قلب سلیم کے عمل کی مثال بھی ملاحظہ فرمایئے، قرآن کریم سورۂ والنجم میں جہاں آنحضرت صلعم کے معراج میں تشریف لیجانے کا واقعہ بیان کیا ہے، وہاں اُن تمام کیفیات کو بیان کرنے کے بعد جو آنحضرتؐ کو پیش آئیں، کہا،

ماکذب الفواد ما رای" — یعنی رسول کی نظر نے جو کچھ دیکھا، قلب نے اس کی تکذیب نہیں کی،

کیوں نہیں کی؟ قلب نے اس لئے نظر کے مشاہدہ کو نہیں جھٹلایا، کیونکہ وہ خود تمام آلائشوں سے پاک تھا، ایک حسین مصفی شکل میں تھا، اور پھر مشاہدہ بھی تمام تر حقیقت پر مبنی تھا لہذا قلب سلیم نے اسکی تصدیق کردی،

اس سے معلوم ہوا کہ قلب کا صحیح مشاہدہ کرنے اور مشاہدہ کی صحت و حسن و خوبی کا اندازہ لگانے کے لئے خود مصفٰی و مجلّٰی ہونا لازمی ہے،

اس کے بعد قرآن کریم کی دوسری آیات اور گمراہ قوموں کے حالات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قلب حقیقۃً اپنی اصل کے اعتبار سے نہایت حسین اور مصفٰی ہے، مگر مختلف عوارض سے جن کا ذکر قرآن کریم میں تفصیل سے ہے، قلب کو مختلف بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں، اور وہ صحیح مشاہدہ کے قابل نہیں رہتا، جب صحیح مشاہدہ اور احساس و ادراک نہیں ہوتا، تو مشاہدہ کے غلط تاثرات سے آگے چل کر جو عقلی اور فکری نتائج مرتب ہوتے ہیں وہ بھی صحت مند نہیں ہوتے،

اس بات کو "اقبال اور جمالیات" کے مصنف نصیر احمد ناصر نے ڈاکٹر اقبال مرحوم کی تائید کے ساتھ اس طرح تعبیر کیا ہے "قرآن حکیم کی رو سے قلب فطری طور پر معصوم ہے، مصفا اور پاکیزہ ہوتا ہے، اور یہ سب حسن کی صفات ہیں، جو انسان کے ذوقِ لطیف، پاکیزگی طبع، اور رفعتِ خیال پر دلالت کرتی ہیں، قلب کی ان صفاتِ ذاتی میں جب کوئی نقص پڑ جاتا ہے، تو اس کا اثر جمالیاتی حس پر بھی پڑتا ہے، جس کا نتیجہ کور ذوقی اور پست خیالی کی صورت میں نکلتا ہے،

فساد رنگ و نظر ہے فرنگ کی تہذیب — کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید — ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف"

(اقبال)

لیکن صحت مند قلب کیوں بیمار ہو جاتا ہے، اس کی ایک وجہ قرآن کریم یہ بیان کرتا ہے کہ جب انسان کے فکر و عمل میں اعتدال نہیں رہتا، تو اس کے قلب کی حالت بدل جاتی ہے، اور وہ حسن قلب کی نورانیوں سے محروم ہو کر اپنی سرکشی کی تاریکیوں میں بھٹکتا رہتا ہے،

ونقلب افئدتھم وابصارھم — اور ہم ان کے دلوں اور نگاہوں
کما لم یومنوا بہ اول مرۃ — کو پھیر رہے ہیں، جس طرح کہ وہ
ونذرھم فی طغیانھم یعمھون — پہلے اس (قرآن) پر ایمان نہیں
(۶ - ۱۱۰) — لائے تھے، اور ہم انھیں چھوڑے دیتے ہیں، کہ وہ اپنی سرکشی کی تاریکیوں میں بھٹکتے رہیں،

اس کے علاوہ قلب جن عوارض کا شکار ہوتا ہے، اُن کو قرآن کریم نے مختلف مقامات پر قوموں کے حالات کے لحاظ سے ان ناموں سے تعبیر کیا ہے۔

۱- بیماری، ۲- کجی ۳- حجاب - ۴ اندھاپن، ۵ طبع - ۶ قساوت، ۷ زنگ آلودگی،

۸۔ غفلت وجہالت، ۹۔ تقفل، ۱۰۔ ختم،

ان عوارض کی تفصیل میں جانے کی تو گنجائش نہیں مگر ذیل کی آیات میں اُن کی طرف نشاندہی ضرور ہو سکتی ہے۔

بیماری: فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضا و لھم عذاب الیم بما کانوا یکذبون، (۲-۱۰)

اُن کے قلوب میں بیماری ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے (قانونِ فطرت کے مطابق) اُن کے مرض کو اور بڑھا دیا ہے، اور اُن کے لئے دردناک عذاب ہے، اس لئے کہ وہ حق کو جھٹلاتے ہیں،

کجی: واذ قال موسیٰ لقومہ یقوم لم تؤذوننی وقد تعلمون انی رسول اللہ الیکم فلما زاغوا ازاغ اللہ قلوبھم و اللہ لا یھدی القوم الفسقین (صف)

اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم والو تم کیوں مجھے تکلیف دیتے ہو، حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں، چنانچہ جب وہ ٹیڑھے چلے تو اللہ نے اُن کے دل ٹیڑھے کر دیئے، اور اللہ تعالیٰ (اپنے قانون) کی وجہ سے حد اعتدال سے تجاوز کرنے والے لوگوں کو منزل مقصود

حجاب: ومن اظلم ممن ذکر بایات ربہ فاعرض عنھا ونسی ما قدمت یداہ انا جعلنا علیٰ قلوبھم اکنۃ ان یفقھوہ وفی آذانھم وقرا، وان تدعھم الی الھدیٰ فلن یھتدوا اذا ابدا، (۱۸-۵۷)

اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے، جسے اس کے پروردگار کی آیتیں یاد دلائی جاتی ہیں، تو وہ منہ موڑ لیتا ہے، اور اپنی گذشتہ سیہ کاریوں کو بھول جاتا ہے، بلاشبہ ہم نے اُن کے دل و دماغ پر پردے ڈال دیئے ہیں، کہ وہ کوئی بات سمجھ نہیں سکتے اور اُن کے کانوں میں گرانی ڈال دی ہے اور تم کتنا ہی ہدایت کی طرف بلاؤ وہ کبھی ہدایت پانے والے نہیں،

اندھا پن: افلم یسیروا فی الارض فتکون لھم قلوب یعقلون بھا او آذان یسمعون بھا، فانھا لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور، (۲۲-۴۶)

کیا یہ لوگ زمین میں سیر و سیاحت نہیں کرتے کہ اُن کے دل و دماغ سمجھنے اور کان سننے کے قابل ہو جاتے، آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، بلکہ قلوب اندھے ہو جاتے ہیں، جو سینوں میں ہیں

طبع: اولم یھد للذین یرثون الارض من بعد اھلھا ان لو نشاء اصبنھم بذنوبھم ونطبع علیٰ قلوبھم فھم لا یسمعون (۷-۱۰۰)

کیا ان لوگوں کے لئے جو پہلی جماعتوں کے بعد ملک کے وارث ہوئے ہیں، یہ بات موجب ہدایت نہیں ہوتی کہ اگر ہم چاہیں تو انہیں بھی پہلوں کی

کی طرح) گناہوں کے سبب مصائب
میں مبتلا کردیں، اور اُن کے دلوں
پر چھاپ لگا دیں، کہ وہ سن ہی نہ سکیں!

قساوت: کذالک یحیی اللہ الموتیٰ
ویریکم ایاتہٖ لعلکم تعقلون
ثم قست قلوبکم من بعد
ذالک فہی کالحجارۃ
او اشد قسوۃ۔
(۲ - ۴۷)

اسی طرح اللہ مردوں کو زندہ کرتا ہے
اور اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم
سمجھو، اگر ایسی نشانیاں دیکھنے کے بعد
بھی تمہارے دل سخت ہو گئے، پھروں
کی طرح سخت، بلکہ سختی میں کچھ اُن سے
بھی بڑھے ہوئے،

زنگ آلودگی: اذا تتلیٰ علیہ ایاتنا
قال اساطیر الاولین، کلا
بل ران علیٰ قلوبھم ما کانو
یکسبون (۸۳ - ۱۴ -)

ایسے شخص پر ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں
تو کہتا ہے یہ تو پچھلے لوگوں کی کہانیاں
ہیں، ہرگز ایسا نہیں بلکہ اُن کے دلوں پر
ان کی سیہ کاریوں کے سبب زنگ لگ گیا ہے،

غفلت وجہالت: ولدینا کتٰب ینطق
بالحق وھم لا یظلمون ہ
بل قلوبھم فی غمرۃ من ھذا
ولھم اعمال من دون
ذالک ھم لھا عملون (۲۳ - ۶۲ - ۶۳)

اور ہمارے پاس کتاب ہے جو حق کے ساتھ
بولتی ہے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائیگا بلکہ
ان کے دل و دماغ اس سے غفلت وجہالت
میں ہیں، اور اس کے علاوہ اُن کے اور
بھی اعمال ہیں، جو وہ کرتے ہیں،

تقفل: افلا یتدبرون القراٰن ام

کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں

علیٰ قلوب اقفالھا، (۴۷ - ۲۴)

کرتے، یا اُن کے دل و دماغ پر قفل چڑھے

ختم: افرئیت من اتخذ الٰھہ
ھوٰہ واضلہ اللہ علیٰ علم
وختم علیٰ سمعہ وقلبہ و
جعل علیٰ بصرہٖ غشاوۃ (۴۵ - ۲۳)

تو کیا تونے اس کا مشاہدہ کیا، کہ جس شخص
نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا لیا ہے، اور
اللہ اپنے قانون قدرت کے مطابق اسے
علم کی دنیا میں گمراہ کر دیا ہے اور اس کے
کان اور دل پر مہر لگا دی ہے اور اسکی

مندرجۂ بالا بحث اور قلب کے عوارض کی نشاندھی کے بعد اب یہ بات پوری تجھ میں آسکتی ہے
کہ ادب کی تخلیق مرہون منت ہے، ذوق کی، اور ذوق دل و دماغ عقل و حواس کے مجموعی
عمل کا نام ہے، دل و دماغ کی جب مختلف عوارض سے حالتیں بدلتی رہتی ہیں، تو اس کا لازمی
سبب ہوگا کہ اس سے وجود پزیر ہونے والا ذوق بھی صحت مند نہ ہوگا، چنانچہ ضرورت اس امر کی ہوئی
کہ اصل علاج دل و دماغ کا ہو، اگر اُن کے مرض کی صحیح تشخیص اور علاج ہو جائے تو ذوق خود بخود
صحت مند ہوگا، جب ذوق صحت مند ہوگا تو حقیقتاً افکار و خیالات ادبی فن پارے تو اعلیٰ تخیلات اس وجود پا گئے
کے سب صالح اور حسین و جمیل، مصفیٰ و مجلیٰ ہوں گے،

ان حقائق کی روشنی میں اب ہم یہ دعویٰ کرنے میں پوری طرح حق بجانب ہیں کہ قرآن
کریم نے اپنے بلیغ انداز اور یکتا اسلوب نگارش سے قلوب انسانی کی ان دکھتی رگوں پر انگلی
رکھی ہے جو صحیح خیالات کی تخلیق میں رکاوٹ ہوتے ہیں، اور پھر ایمان و یقین، اعمال صالحہ
اور عبادات سے ان امراض کا صحیح علاج بھی تجویز کیا، بس یہی وہ بنیادی کام ہے، جو ذوق
سلیم کی تربیت میں اساس کی اور اصل کی حیثیت رکھتا ہے، جسے قرآن حکیم نے بحسن وخوبی بدرجہ
اتم انجام دیا ہے،

(باقی)

شعوبی تحریک اور اس کا انجام

از ڈاکٹر محمد اقبال انصاری صدر شعبۂ اسلامیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

انسان آزادی پسند ہے، کوئی قوم یہ پسند نہیں کرتی کہ کسی دوسری قوم کی غلامی تسلیم کرے، غلامی تو بڑی بات ہے، ذہنی برتری بھی مستقل طور پر تسلیم کرنا کسی کو گوارا نہیں ہوتا، اسلام نے اسی انسانی جذبہ کا لحاظ کر کے خاندانی حکومت اور سرداری کو پسند نہیں کیا، بلکہ خاندان کے بجائے صفات کو اہمیت کی بنیاد قرار دیا، قرآن مجید نے صاف طور سے کہا کہ

یا ایہا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم[1]

اے لوگو ہم نے تمھیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے، اور ہم نے تمھیں جماعتوں اور قبیلوں کی شکل میں اس لئے کیا تاکہ باہم تعارف ہو سکے ورنہ حقیقت تو یہ ہے، کہ تم میں شریف وہ ہے جو اللہ [illegible]

اس آیت نے نسلی غرور کا خاتمہ کر دیا، اور تمام انسانوں کو ایک مرد و عورت کی اولاد قرار دیکر خاندانی افتخار کی جڑ کاٹ دی،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کی وضاحت اس طرح کی:

الا لا فضل لعربی علی عجمی ولا

خوب سمجھ لو کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر اور

[1] قرآن مجید ۴۹: ۱۳

لا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی الاحمر الا بالتقویٰ[1]

اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، نہ کسی گورے کو کالے پر اور نہ کسی کالے کو گورے پر فضیلت [illegible]

اسلام کی اس تعلیم پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں عمل ہوتا رہا، ایک مرتبہ حضرت ابو ذر غفاریؓ نے اپنے غلام کو سخت الفاظ میں کوئی نامناسب بات کہدی تھی، اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں تنبیہ فرمائی تھی اور کہا تھا، ابو ذر تم میں ابھی تک جاہلیت کی خو باقی ہے[2]، آپ تاکید فرماتے تھے کہ غلاموں کو غلام نہیں بلکہ مولیٰ کہا جائے، اور انھیں وہی کھلایا اور پہنایا جائے جو آقا کھائے اور پہنے، آپ نے غلاموں کو اتنا بلند مرتبہ دیا تھا، کہ حضرت عمرؓ حضرت بلالؓ کو سیدنا کہتے تھے[3]، غیر عربوں کا اعزاز اس حد تک بڑھایا کہ حضرت سلمان فارسیؓ کے بارے میں فرمایا، اگر ایمان ثریا کے پاس ہوتا تو بھی یہ لوگ اسے حاصل کر لیتے[4]، حضرت صہیب رومیؓ، اور حضرت بلالؓ حبشی غلام تھے، لیکن ان کو وہ عزت عطا کی کہ بڑے بڑے قریشی اور انصاری ان کی نیازمندی پر فخر کرتے تھے، حضرت زیدؓ عرب نہیں تھے عجمی نژاد تھے، اور غلام کی حیثیت سے خدمت کرتے تھے، مگر آپؐ نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ کے ساتھ ان کی شادی کر دی[5]، ان کے بیٹے حضرت اسامہؓ کو بڑے بڑے مہاجرین وانصار کے سرداروں کا افسر مقرر کیا، یہی طرز عمل خلفائے راشدین کا رہا، انھوں نے کبھی کسی شخص کو محض خاندانی بنیاد پر کسی فوج کی سرداری یا کسی علاقہ کی حکمرانی کا اہل نہیں سمجھا، بلکہ ہمیشہ یہ دیکھا کہ اس کی ذاتی صلاحیت، خدا ترسی، نیک عملی اور کاردانی کی کیا حالت ہے، لیکن خلفائے راشدینؓ

[1] سیرۃ النبی ج ۲ ص ۵۰۰ بحوالہ مسند احمد [2] بخاری کتب الایمان [3] مشکوٰۃ جامع المناقب بحوالہ بخاری [4] ایضاً بحوالہ ترمذی [5] حیات محمد محمد حسین ہیکل، سیرت کی دوسری کتابوں میں بھی یہ حالات مذکور ہیں۔

کے بعد جب بنو امیہ کا دور دورہ ہوا تو وہ محاسن اور فضائل کے اعتبار سے اپنے مخالفین کے کم نہیں تھے، اور اُنہوں نے قبائلی عصبیت کو ہوا دی اور اس عصبیت کے سہارے اپنی خاندانی حکومت کو مستحکم کرتے رہے، ان کے طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاہلیت کی نسل پرستی پھر ابھر آئی، ان کے زمانہ میں غیر عربوں کے لئے یہی راستہ رہ گیا کہ وہ خفیہ سازشیں کریں، اور کسی ایسی حکومت کو برسرِ اقتدار لانے کی کوشش کریں، جس کے ماتحت وہ عزت کی زندگی بسر کر سکیں، چنانچہ اس عہد کی بغاوتوں کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ان کے اندر ان ہی جذبات کی کارفرمائی نظر آئے گی، بالآخر ان ہی عناصر نے عباسیوں کی سربراہی میں اموی حکومت کا تختہ الٹ دیا،

عباسی کہنے کو عرب تھے، لیکن ان کے دست و بازو درحقیقت عجمی تھے، ابو مسلم خراسانی ہو یا برامکہ یہ سب ایرانی انقلاب پسندوں کے ترجمان تھے، اور کچھ ہی عرصہ کے بعد یہ بات نمایاں ہو گئی کہ اس انقلاب کی تہ میں کیا چیز کارفرما ہے، منصور ہوں یا ہارون، مامون ہوں یا معتصم سب ایرانیوں کے اقتدار سے گھبرانے لگے، اور ایرانی سپہ سالاروں اور وزیروں کو قتل کرا کر اپنی خاندانی خلافت کو بچانے کی کوشش کرنے لگے،

عرب اقتدار ہٹانے کے لئے عربوں کی بالادستی کا تصور ختم ہونا ضروری تھا، اس لئے ذہنی تبدیلی کے لئے ایک تحریک اٹھی، جو تاریخ میں "شعوبیت" کے نام سے مشہور ہے، یہ لفظ شعب سے ماخوذ ہے، شروع میں ان لوگوں کی طرف سے اس کا یہ مطلب ظاہر کیا جاتا تھا کہ اسلامی تصور کے مطابق عربوں کے نسلی تفوق کے خلاف یہ احتجاج ہے، لیکن رفتہ رفتہ عربوں کی تحقیر کرنے والے شعوبی کہلانے لگے[۵]

[۵] ملاحظہ ہو لسان العرب طبع بیروت ۱۹۵۵ء ج ۱ ص ۵۰۰، اور صحاح طبع مصر ۱۲۸۲ھ ص ۱۶۷،

آگے بڑھ کر یہ تحریک عرب دشمنی کی حد تک ہی نہیں پہنچ گئی، بلکہ خود اسلام بھی معرضِ بحث میں آگیا، کچھ لوگ تو اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ ان کے خیالات کفر و الحاد تک پہنچ گئے، بڑے بڑے ادیب و شاعر اس خیال کی وکالت کرنے لگے، ان کے جواب میں عربوں کی طرف سے بھی نثر و نظم میں بہت کچھ لکھا جانے لگا، یہ لوگ سمجھاتے تھے کہ عربوں ہی کی بدولت لوگوں کو یہ عزت و حکومت اور دولت و ثروت حاصل ہوئی، اور اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی بدولت زوال پذیر عجمی نئی قوت و توانائی حاصل کر سکے، لیکن شعوبی اپنی قدیم تاریخ اور قدیم تہذیب و تمدن اور علوم و فنون پر فخر کرتے تھے، بعض ان لوگوں نے خوارج کو بھی شعوبیہ کی ایک قسم قرار دیا ہے، لیکن درحقیقت ان کا اختلاف سیاسی اور ایک حد تک مذہبی تھا، عرب بیزاری ان میں شعوبیوں کی طرح نہ تھی[۱]

اموی دور میں عرب بیزاری جو سطح کے نیچے دبی ہوئی تھی، وہ عباسی عہد میں اوپر ابھر آئی، ایک طرف ایرانی تہذیب کے پھولنے پھلنے کے مواقع پیدا ہو گئے، اور دوسری طرف عربوں کے خلاف لکھنے کی نسبتاً زیادہ جرأت ہو گئی، بالآخر ایرانی عناصر نے ایسی قوت پیدا کر لی کہ معمولی تدابیر ان کو زیر کرنے کیلئے کافی نہ ہو سکیں، اور آگے چل کر عباسی خلفاء نے ان کا زور توڑنے کے لئے ترکوں کا سہارا لیا، لیکن یہ ترک بھی آگے چل کر اپنے اقتدار کے خواہاں ہوئے، چنانچہ آئندہ ان ترکوں کے ہاتھوں عباسی خلفاء کٹھ پتلیوں کے درجہ کو پہونچ گئے، جس کو چاہتے تخت پر بٹھاتے اور جس کو چاہتے تلوار کے گھاٹ اتار دیتے،

شعوبی تحریک اگر صرف عربوں کی بالادستی کے خلاف رہتی، اور اسلامی روایات کی مدد سے عربوں کے نسلی تفوق کے خلاف آواز بلند کرتی تو اس کا اثر مستحکم ہوتا، لیکن

[۱] گولڈ زیہر اور احمد امین ضحی الاسلام ج ۱ ص ۶۰-۶۱،

انتہا پسند اشخاص نے اسلامی عقائد پر بھی ضرب لگانی شروع کی، اس کی وجہ سے یہ تحریک نسل پرستی کے خلاف احتجاج کے بجائے الحاد و زندقہ کی علامت بن گئی، عجمی سارے کے سارے منافق نہیں تھے، بلکہ ان کی بھاری اکثریت دل سے مسلمان تھی، اور اپنے اسلام پر فخر کرتی تھی، تفسیر و حدیث اور فقہ و سیر کے بڑے بڑے ائمہ سچے مسلمان تھے، امام ابو حنیفہ امام بخاری، امام مسلم، امام داؤد، امام ترمذی، امام ابن ماجہ، حسن بصری، طاؤس اور ان جیسے بے شمار علماء مصنفین اور اعیان اسلام سچے مسلمان تھے، وہ کسی حال میں اسلاف کے خلاف کوئی بات نہیں سن سکتے تھے، اس لئے اسلام، اکابر اسلام اور روایات اسلام کے خلاف اظہار خیال کرنے والوں کو انھوں نے سخت ناپسند کیا، اور ان کے اس طرز عمل کو کفر و الحاد سے تعبیر کیا، اس کی بنا پر ایسے لوگوں کا زیادہ اثر نہیں ہونے پایا، بلکہ اپنی انتہا پسندی کی وجہ سے آسانی کے ساتھ ان کا قلع قمع ہو گیا، ان کی تحریک تاریخ کے اوراق میں دب کر رہ گئی، اور ان کی یاد برائی کے ساتھ لوگوں کے دلوں میں رہ گئی، فراعنہ اور اکاسرہ پر فخر کرنے والے مٹ گئے، عرب انشا پردازوں ہی نے نہیں، بلکہ عجمی اہل قلم نے بھی ان شعوبیوں کو ترکی بہ ترکی جواب دیئے، اسی طرح عربی زبان کے خلاف اظہار خیال بھی شعوبیوں کی ناکامی کا باعث ہوا، عربی قرآن و حدیث کی زبان تھی کوئی مسلمان اس کی تحقیر گوارا نہیں کر سکتا تھا، اسلئے عربوں ہی نے نہیں بلکہ غیر عرب لغویوں ادیبوں اور شاعروں نے عربی زبان کے تفوق کا اقرار اور اس کی خوبیوں کا اعتراف کیا، اسی طرح علمائے انساب نے بھی شعوبی نسابوں کی غلط بیانیوں کا پردہ چاک کیا، اور نبطیوں، قبطیوں، رومیوں، ایرانیوں، مجوسیوں، یہودیوں اور عیسائیوں کی ان سازشوں کو ناکام بنا دیا، جو وہ عرب دشمنی کے

پردہ میں اسلام کے خلاف کر رہے تھے، جار اللہ زمخشری جیسے ایرانی نژاد کو ان خیالات سے برأت ظاہر کرنی پڑی، اور کتاب المفصل کے دیباچہ میں لکھنا پڑا کہ

خدا کا شکر ہے کہ اس نے ان کے دل میں عربوں کے لئے عصبیت پیدا کر دی اور شعوبیت کی طرف میلان سے انھیں محفوظ رکھا، گولڈزیہر وغیرہ متعصب مستشرق خواہ کتنے ہی زور سے کہیں کہ عباسی خلفاء کے دربار میں موالی کے مقابلہ میں عربوں کے لئے باریابی دشوار ہوتی تھی، اور حاتم طائی اور احنف و ایاس کا دربار میں مضحکہ اڑایا جاتا تھا، لیکن صاحبان نظر پر ان بیانات کی کمزوری عیاں ہے، مامون کی اسلامیت شک شبہہ سے بالاتر ہے، اس نے ایرانی تراجم اسلام دشمنی میں نہیں کرائے تھے، بلکہ علمی سرپرستی مقصود تھی، اسی طرح دوسرے مذاہب کے اہل علم کی قدر دانی اسکی رواداری اور علم دوستی کا مظہر ہے، عربوں پر زیادتیوں کے جن واقعات کو ان مستشرقین نے اسکی ایران نوازی قرار دیا ہے، ان کے اسباب سیاسی ہیں، تاج و تخت کے لئے تو بادشاہوں نے باپ، چچا، بھائی کو تہ تیغ کرنے سے دریغ نہیں کیا، ہے اور عزیزوں کو قید و بند میں مبتلا کیا ہے، ان واقعات کو قومی تحقیر سے کیا تعلق، عرب ہوں یا عجم جس سے اقتدار خطرہ میں ہوا اسے بزن کر دیا گیا،

ان تاریخی واقعات و نتائج سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک طرف نسلی عصبیت اور خاندانی تفوق کی بنیاد پر جو عمارت تعمیر کی جائیگی اسے عوامی تائید حاصل نہیں ہو سکتی ہے، ممکن ہو کہ کچھ عرصہ تک تلوار کے زور اور سیاسی جوڑ توڑ سے اس خاندانی سیادت کو قائم رکھا جا سکے، لیکن عوام الناس کے دل کبھی اسے پسند نہیں کر سکتے، اور نہ وہ ایسی

۵ے ضحی الاسلام جلد ۲ از احمد امین ص ۰۰، ۶ے گولڈزیہر ص ۱۳۸،

نسلی اور قومی حکومت کے حقیقی وفادار ہو سکتے ہیں، انھیں جب بھی موقع ملے گا، ایسی حکومت کو بدلنے کی کوشش کریں گے، کیونکہ غیروں کی غلامی کوئی بھی خوشی سے قبول نہیں کر سکتا، ہے، عربوں کے خلاف جو بغاوتیں ہوئیں اور ان کی حکومت کا تختہ الٹنے کی جو کوششیں کی گئیں، ان کا سبب یہی تھا، اور پھر عثمانی ترکوں کے خلاف خود عربوں نے جو بغاوت کی اس کی وجہ بھی یہی تھی، ان کے خلاف عربوں کی نفرت اس درجہ کو پہونچ چکی تھی کہ انگریزوں اور دوسری عیسائی قوموں سے ساز باز کرنے میں بھی انھیں تکلف نہیں ہوا، ایک ہاشمی کو ناموس دین مصطفیٰ کے بیچنے میں کوئی باک نہیں ہوا نہ خاک حجاز کو خشت بنیاد کلیسا بنانے میں تکلف ہوا، باہر کے لوگ چاہے جو کچھ سمجھتے رہے ہوں، مگر عرب ہر قیمت پر ترکی سیادت کا جوا اپنے کندھے سے اتار پھینکنا چاہتے تھے، اسے نہ جمال پاشا کا تشدد روک سکا، نہ سلطان عبد الحمید کا استبداد، نہ مدحت پاشا کی سیاست اور نہ انور پاشا کی دستور پسندی اور جمہوریت نوازی، نسلی برتری اور قومی تفوق کے تصور پر کسی حکومت کی بنیاد برات عاشقاں بر شاخ آہو کی طرح ناقابلِ اعتبار ہے، اسی طرح اس تفوق کے خلاف جد و جہد کرنے والوں کو بھی اس تجربہ سے یہ سبق ملتا ہے کہ بنیادی عقاید و خیالات پر ضرب لگائی جائیگی تو انقلاب کی دعوت پادر ہوا ثابت ہوگی،

اردو ادب کے تنقیدی اصول

میں

تنظیم و انضباط

از جناب اشفاق علی خاں صاحب ایڈوکیٹ شاہجہانپور

(۲)

تنقید کے تین حصے تنقید کم سے کم تین سوالوں کے جواب پر مشتمل ہے، کیا ہے؟ کیسا ہے؟ کیا ہونا چاہئے؟ پہلے سوال کے جواب میں نقاد شاعر و ادیب کا پیرو ہے، اور اس کے ترجمان کے فرائض ادا کرتا ہے، جواب شاعر و ادیب کا ہوتا ہے اور زبان نقاد کی، دونوں میں اجمال و تفصیل یا متن و شرح کی نسبت ہوتی ہے، اس سوال کے جواب میں نقاد کو شاعر و ادیب سے صرف وہ خیالات منسوب کرنا چاہئیں جو اس کے الفاظ کے قدرتی مفہوم ہوں، وہ خیالات نہیں جو نقاد کے اپنے رجحانات کا پرتو ہوں، اور جن کو شاعر و ادیب سے منسوب کرنے کے لئے شاعر و ادیب کے استعمال کردہ الفاظ سے انحراف کرنا پڑے، اس سوال کے جواب میں نقاد جس قدر اپنی ذات اور خیالات سے الگ اور شاعر و ادیب کی ذات اور خیالات سے وابستہ رہے گا، تنقید کا یہ حصہ اسی قدر مکمل اور صحیح ہوگا، دوسرے اور تیسرے سوال کا جواب نقاد کا اپنا حصہ ہے، اور اس میں وہ شاعر و ادیب کا پیرو نہیں بلکہ اس کا رہنما اور آپ اپنے

خیالات کا ترجمان ہے،

توضیح معیار مگر اس سلسلہ میں اس کا یہ فرض ہے کہ خوب و ناخوب کی وضاحت کرنے کے ساتھ ساتھ ان ضوابط کی بھی وضاحت کردے جو اس توضیح کے لیے اس نے بطور معیار اختیار کیے ہیں، نیز اگر وہ ضوابط عام ضابطوں سے کسی وجہ سے مختلف ہیں، تو ان کی وجہ اختلاف اور وجہ ترجیح پیش کردے، اس ضابطۂ نقد کی جس قدر پابندی کی جائے گی، اسی قدر تنقید کا یہ حصہ مکمل اور صحیح ہوگا، اس حصۂ نقد کی صحت پہلے جواب کی صحت پر بھی منحصر ہے،

موجودہ اردو تنقید کا رجحان ہماری موجودہ اردو تنقید کا رجحان فن نقد اور زیر نقد شاعر و ادیب سے بہت کچھ بے تعلق ہوتا جارہا ہے، پہلے سوال کا جواب اس لئے بے تعلق ہوتا ہے کہ بالعموم ہمارے نقاد ان خیالات کو شاعر و ادیب سے منسوب کرتے ہیں، جو شاعر و ادیب کے اپنے الفاظ کا قدرتی نتیجہ نہیں ہوتے ہیں بلکہ وہ خیالات ہوتے ہیں، جن کو نقاد کسی وجہ سے شاعر و ادیب سے منسوب کرنا چاہتے ہیں، دوسرے سوال کا جواب اس لئے بے تعلق ہوتا ہے کہ اولاً وہ جواب فی نفسہ شاعر و ادیب کا حصہ نہیں، پھر پہلے سوال کا جواب غلط ہو تو دوسرے کا صحیح ہو ہی نہیں سکتا، اس پر مستزاد یہ کہ اس سوال کا جواب مقتضی ہے کہ اس سے پہلے نقاد کے ذہن میں تنقید کے عام یا اس کے اپنے خاص اصول واضح اور متعین ہوں، اور ہمارے بہت سے نقاد اس تقاضے کو مانتے ہی نہیں، تیسرا سوال اس لئے بے تعلق ہے کہ اس کا جواب بھی فی نفسہ شاعر و ادیب کا حصہ نہیں، پھر بالعموم ہمارے نقاد اس کا جواب دیتے ہی نہیں، الغرض طریقۂ نقد کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری تنقید کا بہت بڑا حصہ وہ ہے جس میں ہمارے

نقادوں نے اپنے خیال میں شاعروں اور ادیبوں پر تنقید کی ہے، مگر پڑھنے والوں کے خیال میں وہ نقادوں کے اپنے ذاتی خیالات کی تنقید ہے، ایسے نقاد "حدیث دیگراں" کے پردہ میں اپنا "سرِ دلبری" پیش کرتے ہیں، جو پختہ کار، منزل کے ادب شناس اور اس راستے کے سنگ و میل سے واقف ہیں، ان کو بے راہ رووں کے اس گروہ سے مستثنیٰ کر دینا چاہیے،

شعری کیفیات و خصوصیات کی اصطلاح سازی اردو تنقید میں ایک اور بہت بڑی کمی ہے، مگر وہ ہمارے نقادوں کی نہیں، بلکہ ہماری تنقید کی ہے، وہ کمی یہ ہے کہ شعری کوائف و خصوصیات میں جو عام اور مشترک کوائف و خصوصیات ہیں، وہ اب تک باقاعدہ متعین نہیں کی گئی ہیں، اور جو متعین کی گئی ہیں وہ بہت کم ہیں، نیز ان میں سے اکثر پر ابھی اس حد تک اتفاق نہیں کیا گیا ہے، کہ ان کے لیے فنی اصطلاحات ان کی صحیح تعریف کے ساتھ حاصل ہوسکے، مثلاً جوش، سادگی، رنگینی، اثر، سوز و گداز، درد، تڑپ، روانی، انسجام، بندش الفاظ، ترکیب الفاظ، ترتیب الفاظ، شوخی، فصاحت، بلاغت، سنجیدگی، متانت، زور، شوکت الفاظ، ندرت، جدت، ندرت معنی، جدت معنی، ندرت و جدت ادا، رنگینی خیال، رنگینی ادا، رنگینی الفاظ، شیرینی الفاظ، انداز بیان، لہجہ، انفرادیت، داخلیت، خارجیت، حسن ترکیب، صفائی کلام، متانت ترکیب، نازک خیالی، خیال بندی، نشست الفاظ، کلام کا بانکپن، شوخی مضمون، شوخی بیان، رنگین خیالی، رنگین بیانی، شستگی، گرمی کلام، برجستگی، بلندی مضامین، وغیرہ، ان میں سے بعض الفاظ باہم مرادف ہیں، اور بعض مختلف المعانی، اس طرح کے بیسیوں الفاظ ہمارے نقاد کی زبان قلم پر ہیں، مگر ان کے محل استعمال کے لئے

وہ کسی ضابطہ کے پابند نہیں، جس میں ایسی یکسانی ہو کہ جو لفظ ایک کے یہاں جس مفہوم میں استعمال ہوا ہے، اسی مفہوم میں دوسرے کے ہاں استعمال ہو یا جس خصوصیت و کیفیت کے لئے ایک لفظ ایک نقاد استعمال کرتا ہو، اسی خصوصیت و کیفیت کے لئے دوسرا نقاد استعمال کرتا ہو، بلکہ ہر نقاد ان الفاظ کو اپنے مزعومہ مطالب میں استعمال کرتا ہے، جو اس نے اپنی ذاتی کثرت مطالعہ سے ان الفاظ سے وابستہ کر لئے ہیں، گویا ان لفظوں کا استعمال اور خصوصیات شعری کی تعبیر ایک سماعی عمل ہے، اور ہر شخص کا سماع اس بارہ میں ذاتی اور دوسرے سے جداگانہ ہے، جو کہیں اتفاق سے دوسروں کے استعمال سے مطابق ہو جاتا ہے اور کہیں مختلف، کہیں، ایک ہی لفظ کئی مختلف کیفیتوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، اور کہیں ایک ہی کیفیت کے لئے کئی مختلف الفاظ استعمال ہوتے ہیں، ایک نقاد ایک کیفیت کے لئے کوئی لفظ استعمال کرتا ہے، دوسرا اس کیفیت کے لئے کوئی اور لفظ استعمال کرتا ہے، اس فرق استعمال کی بنا پر اسکا بہت امکان رہتا ہے کہ دو نقاد اپنے مختلف لفظوں سے ایک ہی کیفیت شعری کی توضیح کر رہے ہوں، مگر پڑھنے والا انھیں اختلاف الفاظ کی وجہ سے مختلف کیفیتیں سمجھے یا وہ دو مختلف کیفیتیں بیان کرنا چاہتے ہوں، مگر پڑھنے والا انھیں ایک سمجھے،

اس کمی کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف شاعروں کے یہاں اس قسم کی خصوصیات کی کمی و بیشی کا فرق واضح نہیں ہو پاتا، جو ان کے امتیاز کے لئے ضروری ہے، بلکہ ہر شاعر کی خصوصیات ایک سی معلوم ہوتی ہیں، مثلاً سکسینہ کی تاریخ ادب اردو میں مختلف شاعروں کی تنقید ان کے ناموں سے الگ کر کے پڑھئے، تو سب ایک ہی شاعر کے متعلق معلوم ہوں گی، ایک سکسینہ کیا سب ہی کے ہاں کم و بیش یہی صورت ملے گی،

یہ صحیح ہے، اس خلط مبحث کا سبب ان نقادوں کی وہ غلطی بھی ہے، جو ان سے شعراء کی خصوصیات کے مطالعہ اور سمجھنے میں سرزد ہوتی ہے، مگر اس کا ایک بڑا سبب ہماری تنقید کی یہ کمی بھی ہے،

۲۔ لفاظی وابہام | اس سے بھی زیادہ بڑی دشواری بلکہ عیب اردو تنقید میں یہ پیدا ہو گیا ہے کہ کسی ایک کیفیت شعری کی تشریح و توضیح اور افہام و تفہیم کے لئے نقاد بلاوجہ جملہ کے جملہ استعمال کرتے ہیں جو خود بے معنی ہوتے ہیں، یا کم سے کم اس کیفیت سے بے تعلق ہوتے ہیں، نیز کوائف شعری کو زندگی اور کائنات کے دوسرے شعبوں اور مثال دیگر ان سے تشبیہ و استعارہ کر کے اپنا مافی الضمیر ان کیفیتوں کی نسبت سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ تمثیل و تشریح وغیرہ خود محتاجِ تشریح ہوتی ہے اور اس لئے کیفیت شعری بدستور تشنۂ تشریح رہ جاتی ہے، تنقید کے اس اسلوب کا خاکہ محمد حسین آزاد نے تیار کیا تھا، مگر ان کا ایسا کرنا بجا تھا، کچھ اسلئے کہ وہ ابتدائی نقش تھا اور کچھ اس لئے کہ دنیا بھر کی باتیں کر کے، وہ کتاب کو دلچسپ بنانا چاہتے تھے، پھر وہ مجبور تھے کہ ان کا عام طرز تحریر یہی تھا، جس کے بغیر وہ دو قدم نہیں چل سکتے تھے، مثلاً

”بہت سی فارسی کی ترکیبیں جو مصری کی ڈلیوں کی طرح دودھ کے ساتھ منہ میں آتی تھیں، انھیں گھلا یا (ص ۱۳۰)

مرزا (سودا) کی زبان نظم میں کبھی دودھ ہے، کبھی شربت مگر نثر میں بڑی مشکل ہوتی ہے، فقط مصری کی ڈلیاں چبانی پڑتی ہیں (ص ۱۵۷)

بندش کی چستی اور ترکیب کی درستی سے لفظوں کو اس در و بست کے ساتھ پہلو بہ پہلو جڑتے ہیں، گویا ولایتی طپنچہ کی چاپیں چڑھی ہوئی ہیں (ص ۱۵۸)

ظہوری کی کیا غزلیں کیا قصائد دونوں استعاروں اور تشبیہوں کے پھندوں
سے الجھا ہوا ریشم ہیں (ص ۱۶۳)

پردرد گویا تلواروں کی آبداری نشتر میں بھر دیتے تھے (ص ۱۸۵) ان کی
انشا پردازی کا حسن تکلف اور صناع مصنوعی سے بالکل پاک ہے، اس خوشنمائی کی
ایسی مثال ہے، جیسے ایک گلاب کا پھول ہری بھری ٹہنی پر کٹورا سا دھرا ہے،
اور سرسبز پتیوں میں اپنا اصلی جوبن دکھا رہا ہے (ص ۱۹۵)

ان کے اشعار غزل کے اصولوں میں گلاب کے پھول ہیں (ص ۲۵۴)

پنڈت دیا شنکر نسیم نے ہر مضمون کو تشبیہ اور استعارہ میں ادا کیا، اور وہ
ادا معشوقانہ خوش ادائی نظر آئی، اس کے پیچ دار بانکپن کی مروڑ میں جو بڑا دیں
بانکا دوپٹہ اوڑھ کر دکھاتی ہیں (ص ۲۵۶)

کلام کا بند بست ارگن باجہ کی کساوٹ رکھتا ہے (ص ۲۷۲) شعر کی تڑپ اور
کلام کی تاثیر (ص ۳۵۷) (گویا تڑپ اور تاثیر شعر کی دو مختلف خصوصیتیں ہیں،

قدرتِ کلام ان کے ہر ایک نازک اور باریک خیال کو محاورہ اور ضرب المثل
اس طرح ترکیب دیتی ہے جیسے آئینہ گر شیشہ کو قلعی سے ترکیب دیکر آئینہ بناتا
ہے (ص ۴۴۸) (آب حیات سے مقتبس)

تمثیل و تشبیہ ایک اضافی کی حیثیت سے استعمال کی جا سکتی ہے، وہ بھی کہیں
کہیں اور بہت اعتدال کے ساتھ، مگر اسی کے ساتھ تمثیل و تشبیہ بھی وہ ہونی چاہئے
جو شعری کیفیت کے حسب حال ہو، یعنی اس میں اور شعری کیفیت میں کوئی وجہ
شبہ ہو، اور جس حاسہ (ظاہری یا باطنی) سے شعری کیفیت محسوس ہوتی ہو، اسی

مشبہ بہ محسوس ہو، یہاں آزاد کے اقتباسات کی طرف اشارہ پر اسمائے اکتفا کیا گیا
ہے کہ اولاً اس عہد میں وہ معذور تھے، دوسرے موجودہ عہد کے کسی ایک یا چند
نقادوں کے ہاں اس کمی کی نشاندہی کرتا جو ہمارے نقادوں کی نہیں بلکہ ہماری تنقید
کی ہے، ایک غیر ضروری فعل ہے ورنہ اس کی مثالیں آج بھی کثرت سے ملیں گی، اس
اسلوب نے اردو تنقید میں لفاظی اور ابہام پیدا کر دیا ہے، جس کا ہم تجزیہ و تحلیل کریں
تو صرف چند خوشنما لفظ ملیں گے، جن کا تعلق نہ شعری خصوصیات سے ہوگا نہ فن سے،
اس کی تلافی کا کام اہم ہے اور یہ مستقل تصانیف چاہتا ہے، ضرورت ہے کہ اہل علم
اس پر قلم اٹھائیں، اس کی انجام دہی کے لئے انھیں مندرجۂ ذیل امور مد نظر رکھنے چاہئیں

(۱) عربی و فارسی کے علم معانی و بیان، بدیع، لغت، صرف و نحو اور شاعری کے دوسرے
علوم اس کام میں بہت مدد ہیں،

(۲) عربی و فارسی کے مستند نقادوں کی تنقیدی تحریروں میں دیکھیں کہ وہ کوائف
شعری کے اظہار و ادا کے لئے کیا طریقہ اختیار کرتے ہیں،

(۳) ان علوم کے ہندی مرادفات بھی نظر میں رکھیں،

(۴) یوروپین زبانوں خصوصاً انگریزی میں Diction Appreciations
اور Technique وغیرہ کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا جاتا ہے، اسے کسی طرح نظر انداز
نہ کریں،

(۵) ان سب کے مجموعی مطالعہ کی روشنی میں قیاس کو اعتدال کے ساتھ
استعمال کریں، اور اردو کے مزاج کا لحاظ رکھتے ہوئے ان مآخذ میں جہاں جہاں
ضرورت سمجھیں مناسب ترمیم و تنسیخ اور تہذیب و تجدید سے کام لیں اور اخذ ما

صنفا ودع ما کدر کو اپنا دستور العمل قرار دیں، عربی کے معانی و بیان اور بدیع کی ترمیم و تجدید اس کام کے لئے خاص طور پر ضروری ہے،

عروض ہماری تنقید شعر کی ایک اور ضروری خصوصیت سے پہلو تہی کرتی ہے، اور وہ شعر کا نغمہ ہے، اس خصوصیت کو ایک مستقل فن کی حیثیت حاصل ہے، جسے عروض کہتے ہیں، ہمارے اکثر نقاد اپنی تنقیدوں میں عروض کی بھول بھلیاں کو اس لائق نہیں سمجھتے کہ اس کی سیر کی جائے، اور اس سے بالا بالا ہی گذر جاتے ہیں، مگر فن کی پیچیدگی اس کے قابل ترک ہونے کی دلیل نہیں، عروض عملاً شعر کی اساس اولین ہے، جو نقاد شعر کی تنقید کے سلسلہ میں عروض سے تعرض نہیں کرتے، حق یہ ہے کہ وہ شعر کی تنقید کا حق صحیح معنوں میں ادا نہیں کرتے،

معارف کے گذشتہ سالوں کے مکمل فائل اور متفرق پرچے

معارف علوم و معارف کا گنجینہ مشرقی و مغربی علوم و فنون کا دائرۃ المعارف اور ہزاروں علمی، ادبی، تنقیدی، تاریخی، فقہی، دینی مضامین اور تحقیقات کا ایک دلآویز مجموعہ ہے، اسکی اسی دلآویزی اور اہمیت کی بنا پر اس کا آوازہ شہرت ہندوستان کی چہار دیواری سے گذر کر یورپ و امریکہ اور ایشیا کے دوسرے ملکوں تک پہنچ گیا ہے، مستشرقیات کے جن غیر مسلم فضلاء نے غلط فہمی کی بنا پر جب جب بھی اسلام پر اعتراضات کئے تو سید صاحب اور ان کی نگرانی میں دار المصنفین کے نقاد و محققین نے انکے دندان شکن جوابات اسی کے صفحات پر دئیے ہیں، متفرق پرچوں کے علاوہ حسب ذیل سالوں کے فائل تو بالکل مکمل موجود ہیں:- ۱۹۲۰، ۲۵، ۱۹۲۶، ۱۹۳۸، ۱۹۳۹، ۱۹۴۱، ۱۹۵۱، ۱۹۵۳، ۱۹۵۴، ۱۹۵۵، ۱۹۶۹، ۱۹۷۳، ان کو خرید کر اپنے کتبخانہ کی رونق بڑھائیں،

"منیجر"

مطبوعات جدیدہ

"تاریخ محمدی" - تصحیح و تحشیہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی تقطیع کلاں کاغذ بہتر طباعت ٹائپ صفحات ۴۳۲ مجلد - قیمت درج نہیں۔ پتہ:- شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

گیارہویں صدی ہجری میں مرزا محمد بن رستم کی شخصیت باکمال سمجھی جاتی تھی، ان کے والد بھی نامور فاضل اور چچا دیوانگن عہد عالمگیری کے امرا میں تھے، ان کی تصنیفات میں "تاریخ محمدی" اہم اور مفید کتاب ہے، اس میں سلاطین امرا اور دوسرے طبقہ کے مشاہیر و اعیان کے سنین وفات قلمبند کیے گئے ہیں، یہ دو جلدوں میں ہے زیر نظر کتاب دوسری جلد کا چھٹا حصہ ہے، اس میں ۱۱۰۱ھ سے ۱۱۶۱ھ تک کے امراء اور اصحاب کمال کے وفیات اور بعض کے مختصر حالات و کمالات درج ہیں، تاریخ محمدی ابھی تک غیر مطبوعہ تھی اس لئے ملک کے مشہور اہل علم مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے رضا لائبریری رامپور کے مخطوطہ کو لندن کے ایک اور نسخہ سے مقابلہ کرکے محققانہ حواشی اور اشاریات کے ساتھ شائع کیا ہے، متن میں ہر ترجمہ کے بعد ان حوالوں اور کتابوں کا نام بھی دیا گیا ہے، جن سے مصنف نے مدد لی تھی، لائق محشی نے حاشیے میں تحقیق و محنت سے بعض اشخاص کے مزید حالات اور متعدد دوسرے ماخذوں کی نشاندہی کی ہے، تذکرہ، تراجم اور ہندوستان کی تاریخ پر کام کرنے والوں کو اس کتاب سے بڑی مدد ملے گی، اس کی پہلی جلد میں جو زیر طبع ہے، مصنف کے حالات و سوانح تحریر کیے گئے ہیں،

مجاہد کی اذان - مترجمہ- مولوی محمد عنایت اللہ صاحب اصلاحی تقطیع خورد،

کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۲۶۴ قیمت ع۔ پتہ مکتبۃ الحسنات رام پور۔ یو۔پی

یہ مصر کی مشہور اسلامی تحریک اخوان المسلمین کے بانی شیخ حسن البناؒ کے بعض رسالوں کا اردو ترجمہ ہے، اس میں تحریک کے اصول و مقاصد اور طریقۂ دعوت و تبلیغ کے علاوہ اس کے رہنماؤں اور کارکنوں سے متعلق ضروری معلومات فراہم کئے گئے ہیں اور ان مشکلوں اور آزمائشوں کا بھی ذکر ہے، جو اس کاروان حق کو جہاد و اشاعت دین کی راہ میں پیش آتی ہیں، شیخ نے اخوان کو ایک ایسی خدائی و آفاقی تحریک بنایا ہے، جس کو رنگ و نسل قوم و وطن اور علاقائیت سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس ضمن میں فقہی و فروعی مسائل کے ساتھ مسلمانوں اور غیر مسلمانوں نیز عالم عرب، مسلم اور غیر مسلم ممالک کے بارے میں اخوان کے رویے اور طرز عمل کی وضاحت کی گئی ہے، اس سے ان پر بغاوت اور غداری کے ان الزامات کی مکمل تردید ہو جاتی ہے جن کے نتیجہ میں اخوان کو قید، جلاوطنی اور پھانسی کی سزائیں دی گئی تھیں، اس کتاب سے اخوان کے اصلاحی و مجاہدانہ کارناموں کے علاوہ ایک دینی تحریک کے خط و خال اور اسلام کے دعوتی و تبلیغی مشن کا خاکہ بھی سامنے آجاتا ہے، اس حیثیت سے ہر مسلمان کے لئے اس کا مطالعہ مفید ہے، شروع میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، مولانا ابو الاعلیٰ مودودی، مولانا عبید اللہ رحمانی اور خود مترجم نے شیخ کے دعوتی کارنامے اور اسلام کی سربلندی کے لئے اخوان کی جد و جہد کا مختصر تذکرہ کیا ہے، ترجمہ مجموعی حیثیت سے بہتر ہے، لیکن کہیں کہیں عربی اسلوب کی طرح اردو میں بھی ضرورت سے زیادہ مترادف الفاظ اور جملوں کی کثرت ہے۔

سلک گلک۔ مرتبہ۔ جناب ڈاکٹر شرف عالم صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۹۰، قیمت للعہ پتہ۔ ڈاکٹر شرف عالم لکچرر شعبہ فارسی بی۔ ان کالج پٹنہ

پروفیسر سید حسن سابق صدر شعبہ فارسی پٹنہ یونیورسٹی کا اصلی مشغلہ درس و تدریس تھا،

ان کا زیادہ وقت اس میں اور اس سے متعلق کاموں میں گذرا ہے لیکن ان کو تحریر و تصنیف کا بھی عمدہ ذوق ہے، اس لیے وہ وقتاً فوقتاً ادبی و تحقیقی مضامین بھی لکھتے رہے ہیں، فارسی زبان و ادب انکا خاص موضوع ہے، اس سے متعلق ہند و ایران کے رسالوں میں شائع ہونے والے مندرجہ ذیل آٹھ مضامین کا یہ مجموعہ ان کے عزیز شاگرد ڈاکٹر محمد شرف عالم لکچرر فارسی بہار نیشنل کالج پٹنہ نے شائع کیا ہے۔ (۱) کچھ مظہر کے بارے میں (۲) حافظ کا معشوق (۳) فارسی کی ایک قدیم فرہنگ (۴) ایران کی جدید شاعری اور امن و صلح کا موضوع (۵) ایران جدید کا ایک عوامی شاعر (۶) جگر کا فارسی کلام (۷) قدیم ترین مقدمہ فارسی بر سفر ناصر خسرو (۸) کتابخانہ خدا بخش

آخر الذکر دونوں مضامین فارسی میں لکھے گئے ہیں۔ پہلے میں سفرنامۂ ناصر خسرو کے اس اڈیشن کا ذکر ہے جو ۱۸۸۲ء میں مولانا حالی کے مقدمہ کے ساتھ دہلی سے شائع ہوا تھا، لیکن دانشوران ایران کو اسکی خبر نہیں تھی، پروفیسر سید حسن نے ان کی واقفیت کے لیے حالی کے مختصر حالات اور ان کے مقدمہ کی اہمیت و خصوصیت تحریر کی ہے، دوسرے میں خدا بخش خاں لائبریری کا تعارف اور اس کے بعض نوادر کا ذکر ہے۔ پہلا مضمون زیادہ اہم اور محققانہ ہے اس میں فاضل مقالہ نگار نے محنت و دیدہ ریزی سے اپنے بعض پیشرو محققین کے برخلاف مظہر کو ایرانی الاصل ثابت کیا ہے، تیسرا مضمون بھی تحقیقی حیثیت سے اہم ہے اس میں ایک قدیم فرہنگ زفان گویا کا مبسوط تعارف ہے، جس کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری میں ہے، دوسرے چوتھے اور پانچویں مضمون سے قدیم اور جدید فارسی شعر و ادب سے مقالہ نگار کی گہری واقفیت اور دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے، یہ سب مضامین ادبی و تنقیدی حیثیت سے بہت ہی مفید اور پر از معلومات ہیں۔ شروع میں ان کے خود نوشت دلچسپ حالات درج ہیں، ان میں انکے خاندان

وطن، تعلیمی، ریاضت، درسی مشغولیتوں، سفر ایران، علم و مطالعہ میں انہماک، ادبی و تحریری سرگرمیوں، گذشتہ نصف صدی کے بعض اہم واقعات اور اساتذہ و طلبہ اور معاصرین و احباب کے علاوہ بہار کی کئی مشہور و ممتاز شخصیتوں کا ذکر ہے، جو اس بے ساختگی و بے تکلفی سے لکھے ہیں کہ ان میں خود ستائی کا کوئی رنگ نہیں آنے پایا ہے۔ امید کہ یہ خوان ادب ادبی حلقہ میں دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

فلسفی غالب - مرتبہ - جناب احمد رضا صاحب رٹائرڈ جج، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۹۲ مجلد قیمت ۶ؔ ے پتہ مصنف شیش محل لکھنؤ۔

غالب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، یہ نئی کتاب بھی نو ابواب پر مشتمل ہے، اس میں غالب کے اشعار کی تشریح کرکے دکھایا گیا ہے کہ وہ ایک بڑے فلسفی، مفکر اور مصلح تھے اور ان کی غزلوں کے بیشتر اشعار اسی مقصد سے کہے گئے ہیں، جابجا مصنف نے غالب کے کلام میں تضاد کی نفی اور مولانا حالی مرحوم اور دوسرے شارحین غالب کے بیان کردہ مفہوم کو غلط قرار دیا ہے، حالانکہ کہیں کہیں تو ان کے اور شارحین کے مفہوم میں صرف تعبیر کا فرق ہے اور کہیں کہیں انکا مفہوم عجلت پسندی اور غور و فکر کی کمی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے، جابجا اس قسم کا نامناسب اور مدعیانہ انداز بھی کھٹکتا ہے کہ "ابتک کسی کو بھی غالب کی شخصیت کی عظمت کا قرار واقعی اندازہ نہیں ہوا، اور نہ کسی سے ان کے سخن سمجھنے کی صلاحیت کا اظہار ہوا ہے۔" ص ۴۶ پر اکبر الہ آبادی اور ص ۱۶۴ و ۱۶۵ پر اقبال کے اشعار پر اعتراضات سے انکی "سخن فہمی" کی حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے۔

"ض"

مختصر فہرست کتب

سلسلۂ سیرۃ النبی، سیر الصحابہ و تاریخ اسلام کے علاوہ دار المصنفین نے اور بھی بہت سی کتابیں شائع کی ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں:-

دینِ رحمت

بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے، اسی طرح وہ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات کے اعتبار سے انسان کے تمام طبقوں، بلکہ تمام کائنات کے لئے سراسر عدل و رحمت تھا، اس کتاب میں اسی پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے قیمت ۱۰ؔ مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی

سیرت عمر بن عبد العزیزؒ

خلفائے بنو امیہ میں مختلف حیثیتوں سے عمر بن عبد العزیزؒ کا دور خلفائے راشدین کی طرح بڑے خیر و برکت کا دور رہا ہے، بلکہ تاریخ میں وہ اپنے عدل و انصاف کے لحاظ سے عمر ثانی کی حیثیت سے مشہور ہیں، انھوں نے اپنے دور میں پچھلے خلفا کے دور کی تمام بے عنوانیوں کو ختم کر دیا تھا، یہ انہی کی مولانا عبد السلام ندوی کے سحر طراز قلم سے سوانح عمری ہے، جس میں اُن کے حالات زندگی کے ساتھ اُن کے مجددانہ کارنامے بھی آگئے ہیں، قیمت :- ۶ روپیہ ۲۵

صاحب المثنوی

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری کے ساتھ حضرت شمس تبریز کی ملاقات کے بعد اُن میں جو زبردست روحانی انقلاب پیدا ہوا ہے، اس کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ قیمت :- ۶ روپے پچیس پیسے،

مؤلفہ:- قاضی تلمذ حسین مرحوم

"منیجر"